178
کالا چور
اشتیاق احمد
Uploaded for:
www.urdufanz.com
By: SHJ3

بسم اللہ الرحمن الرحیم
سیریز
محمود فاروق فرزانہ اور انسپکٹر جمشید
178
کالا چور
اشتیاق احمد

ناشر : طاہر ایس ملک
تزئین : محمد سعید نامدار
سرورق : انداز

طاہر ایس ملک
نے (صفدر علی) اداره عبدالرشید پرنٹرز، لاہور
سے چھپوا کر
انداز پبلی کیشنز (مطبوعات اشتیاق)
سے شائع کیا۔

قیمت : ۱۵/- روپے

مطبوعات اشتیاق
۱۲/۹ نصیر آباد مسلم پورہ، سانده کلاں لاہور
فون : ۴۲۳۹۳۵۶ — ۷۱۱۲۹۶۹

انداز پبلی کیشنز
سیکنڈ فلور میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ
اردو بازار۔ لاہور۔

حدیث شریف

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اعمال کا دارومدار نیت پر ہے، ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی؛ چنانچہ جس نے ہجرت کی، دنیا کمانے کے لیے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے تو اس کی ہجرت اس (مقصد) کے لیے ہے جس مقصد کے لیے ہجرت کی —

— بخاری شریف —

ناول پڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ

- یہ وقت نماز کا تو نہیں —
- آپ کو سکول کا کوئی کام تو نہیں کرنا —
- کل آپ کا کوئی ٹسٹ یا امتحان تو نہیں —
- آپ نے کسی کو وقت تو نہیں دے رکھا —
- آپ کے ذمے گھر والوں نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا۔

اگر ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو ناول الماری میں رکھ دیں، پہلے نماز/وہ سب کاموں سے فارغ ہو لیں، پھر ناول پڑھیں۔ شکریہ!

مخلص:

اشتیاق احمد

دو باتیں

السلام علیکم!

"سنہری چٹان" آپ پڑھ چکے ہیں۔ گویا آپ نے میری ہی نہیں، اپنی زندگی کا بھی سب سے ضخیم ناول پڑھ لیا ہے۔ خاص نمبر کے بعد بے تحاشہ خطوط موصول ہونا میری زندگی کا ایک معمول بن گیا ہے۔ لہٰذا یہ اب کوئی عجیب بات نہیں رہ گئی۔ ہاں کچھ اور عجیب باتیں ضرور ہیں۔ جن کا ذکر ضروری ہے۔ خاص نمبر کی تیاری کے سلسلے میں ہر مرحلے پر رکاوٹیں پیش آئیں۔ رکاوٹ پر رکاوٹ، رکاوٹ پر رکاوٹ۔ اور پھر اتنی رکاوٹیں مجھ پر پڑیں کہ ہر رکاوٹ آسان ہو گئی۔ آخری مرحلے تک رکاوٹیں۔ یہاں

تک کہ کراچی کا ٹرک جس پر خاص نمبر بھیجا
گیا۔ کراچی کی چنگی پر روک لیا گیا، اس
میں کوئی غیر قانونی چیز تھی شاید۔ چھے
دن تک ٹرک روکے رکھا گیا۔ یہ آخری
رکاوٹ سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ اور
کراچی والوں کے لیے بہت زیادہ اذیت دے
گئی۔ میں کراچی کے قارئین سے دلی
ہمدردی کے سوا اور کر بھی کیا سکتا ہوں۔
امید ہے۔ درگزر کر گزریں گے۔

چائے واپس

"مجھے ایک گھر میں ایک جرم کرنا ہے، میں
نے ایک دوست۔ بہت ہی قریبی دوست کو جب
اس جرم کے بارے میں بتایا تو اس نے مجھ سے
ایک عجیب بات کہی۔ یہ کہ ہم تو اس وقت مانیں
گے جب میں یہ جرم انسپکٹر جمشید اور اس کے
بچوں کی موجودگی میں کروں، اور ان کی نظروں
سے بچ جاؤں۔ وہ جرم کا سراغ نہ لگا سکیں،
اور مجھے گرفتار نہ کر سکیں۔ یہ چیلنج میرے لیے
عجیب بھی ہے۔ اور سنسنی خیز بھی، لیکن میں نے
فیصلہ کر لیا ہے کہ اب اگر جرم کروں گا تو
آپ لوگوں کی موجودگی میں۔ ورنہ نہیں۔ لہٰذا آپ
تیار ہو جائیں۔ اس ماہ کی ۱۸ تاریخ کو میں جرم
کروں گا۔ جس مقام پر جرم ہو گا۔ وہاں آپ

لوگ ضرور موجود ہوں گے — آپ کو پہلے ہی
خبردار کر دیا — تاکہ بعد میں، میں اپنے دوست سے
یہ بات بھی نہ سُن سکوں کہ آپ لوگوں کو تو دراصل خبر
ہی نہیں تھی — ان الفاظ کے ساتھ ہی میں یہ خط
ختم کرتا ہوں — ارے ہاں! میں اپنا نام تو بتانا
بھول ہی گیا — میں ہوں —

کالا چور۔"

انھوں نے حیرت زدہ انداز میں اس خط کو پڑھا — پھر
ایک دوسرے کی طرف دیکھا:

"آپ کا کیا خیال ہے ابا جان؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"ایسے شیخی خوروں کی باتوں کی طرف میں توجہ نہیں دیا
کرتا۔" انھوں نے منہ بنایا۔

"سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں آج کہیں جانا ہے؟" محمود
بولا۔

"نہیں! ابھی تک تو کہیں جانے کے بارے میں علم نہیں
ہے — اگرچہ آج ۱۸ تاریخ ہے۔"

"اور ۱۸ تاریخ کو کالے چور کو جرم کرنا ہے — لیکن
کہاں — اور ہم وہاں کس طرح موجود ہوں گے — ہم تو
اپنے گھر میں بیٹھے ہیں۔" فاروق نے منہ بنا کر کہا۔

"میں اسی لیے تو کہہ رہا ہوں — ایسے لوگوں کی باتوں
پر توجہ نہیں دینی چاہیے — یہ لوگ بس ڈینگیں مارتے
رہتے ہیں۔"

"چلیے — آپ کہتے ہیں تو نہیں دیتے — ہمیں کیا پڑی
ہے توجہ دینے کی — ہمیں تو آج کہیں جانا ہی نہیں
ہے — گویا راوی عیش ہی عیش لکھتا ہے — اور ہم۔"

فاروق کے الفاظ درمیان میں رہ گئے — اس وقت
گھنٹی بجی تھی — جوں ہی گھنٹی بجی، فرزانہ بول اُٹھی:

"بلاوا آ گیا۔"

"میں نے چائے تیار کر دی ہے — چائے پیے بغیر
آپ لوگ کہیں نہیں جا سکتے۔" بیگم جمشید نے باورچی خانے
سے نکلتے ہوئے کہا۔

"کس کا بلاوا — کیسا بلاوا — دماغ تو نہیں چل گیا —"
فاروق نے فرزانہ کو گھورا۔

"آپ فکر نہ کریں امی جان — ہم چائے کے ساتھ پورا
پورا انصاف کر کے جائیں گے۔" محمود نے دروازے کی طرف
جاتے ہوئے کہا۔

"تم نے یہ کیوں کہا تھا فرزانہ — بلاوا آ گیا۔" انسپکٹر جمشید
نے حیران ہو کر پوچھا۔

"آج ۱۰ تاریخ ہے۔ اس نے بھی ۱۰ تاریخ اپنے خط میں لکھی ہے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ ۱۰ تاریخ یونہی گزر جائے۔"

اسی وقت محمود نے دروازہ کھول دیا، فوراً ہی خان رحمان کی چہکتی ہوئی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی:

"السلامُ علیکم!"

"آہا۔ یہ تو انکل ہیں۔ وعلیکم السلام۔"

"تت۔ تم نے کیا سمجھا تھا۔ دروازے پر کون ہو گا۔"

"جی بس۔ کیا بتائیں کہ ہم نے کیا سمجھا تھا۔" محمود نے منہ بنایا۔

"کیوں کیوں۔ خیر تو ہے۔"

"آئیے۔ اندر آ جائیے۔ پہلے اطمینان سے بیٹھ تو جائیں۔"

"نہیں بھئی۔ میں اطمینان سے بیٹھنے نہیں آیا، بلکہ تم لوگوں کو لینے آیا ہوں۔ ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ چلنے کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔ کوئی تیاری وتیاری نہیں کرنے دی جائے گی۔"

"جانا کہاں ہے؟"

"نہیں بتایا جائے گا۔ پروفیسر صاحب باہر کار میں بیٹھے انتظار کر رہے ہیں۔" انھوں نے کہا۔

"ارے! یہ کیا۔ آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ انھیں ساتھ اندر کیوں نہیں لائے۔" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"وہ خود نہیں آئے۔ ان کا کہنا ہے کہ تم لوگوں کو جلد از جلد گھر سے باہر نکالنے کا یہ سنہری طریقہ ہے۔"

"ہے تو شاید یہی بات۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ہائیں! تم لوگ ابھی اُٹھے نہیں۔" خان رحمان نے آنکھیں نکالیں۔

"اندر کا آرڈر بھی تو سُن لو خان رحمان۔ تمھاری بھابی کا کہنا ہے کہ ہم لوگ چائے پیے بغیر نہیں جا سکتے۔"

"اوہ! یہ تو بہت ٹیڑھا مسئلہ ہو گیا۔ اب بھابی سے کون ٹکر لے۔" خان رحمان نے بوکھلا کر کہا۔

"جائیے پھر۔ پروفیسر صاحب کو بھی بلا لائیے۔ چائے پی کر چلتے ہیں۔"

"ہُوں۔ اب۔ اب شاید یہی کرنا ہو گا۔" خان رحمان یہ کہہ کر مڑنے لگے۔

"ایک منٹ بھائی جان۔ اگر کام اتنا ہی اہم ہے تو میں اپنی چائے واپس لیتی ہوں۔" بیگم جمشید نے مسکرا کر کہا۔

"کیا کہا امی جان۔ چائے واپس لیتی ہیں۔" فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں ! بالکل اسی طرح جس طرح الفاظ واپس لیے جاتے ہیں" وہ مسکرائیں۔

"اوہ۔ بہت بہت شکریہ بھابی۔ آپ سے اچھی بھابی بھی دُنیا میں کسی کی نہ ہو گی۔ آؤ بھئی اب تو اُٹھ چلو"

آخر وہ ان کے ساتھ باہر نکلے ۔۔۔

"کیوں۔ کیسی ترکیب رہی ۔ میں نہ کہتا تھا" پروفیسر داؤد کی شوخ آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی ۔

"آپ کی ترکیب بالکل فٹ رہی۔ بس ایک ذرا سا رخنہ پڑنے لگا تھا"

"رخنہ ۔ کیسا رخنہ ؟"

"بھابی میرے اندر جانے سے پہلے ہی کہیں یہ کہہ چکی تھیں کہ یہ لوگ آج کے دن چائے پیے بغیر کہیں نہیں جا سکتے"

"اوہ ۔ تو پھر ۔ یہ رخنہ کس طرح دُور ہوا؟"

"بس انھوں نے میرا لحاظ کیا ۔ اور آپ کا بھی ۔ اپنی چائے واپس لے لی"

"کیا کہا ۔ چائے واپس لے لی" ان کے لہجے میں حیرت تھی ۔۔

"ہم نے بھی حیرت ظاہر کی تھی ۔ لیکن انھوں نے جواب دیا کہ الفاظ بھی تو واپس لے لیے جاتے ہیں ۔ اگر وہ چائے

واپس لے لیں گی تو کون سی نئی بات ہو گی"

"بھئی واہ ۔ مزا آگیا" انھوں نے بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا ۔۔

"لیکن ۔ انکلز ۔ آپ لوگوں نے اب تک نہیں بتایا کہ جانا کہاں ہے ؟"

"ابھی نہیں بتائیں گے بھئی"

"جب کہ ہم چاہتے ہیں ۔ اس وقت بتا دینا بہتر ہو گا"

"وہ کیوں ۔ کیا تم ساتھ جانے سے انکار کرنا چاہتے ہو؟" پروفیسر داؤد بولے ۔

"جی نہیں ۔ ایسی کوئی بات نہیں" محمود نے جلدی سے کہا ۔۔

"تو پھر"

"پھر یہ کہ ۔ ابا جان کیا خیال ہے؟" محمود نے جلدی سے ان کی طرف دیکھا ۔

"یہ کیا بات ہوئی ۔ ہم سے بات کرتے کرتے تم ان سے بات کرنے لگے"

"اس میں بس یہی بات تو بری ہے" فاروق مسکرایا ۔

"اور تم میں ۔ اپنی بھی تو کہو" محمود بھنا کر اس کی

طرف مڑا۔

"مجھ میں بھی۔ میں بھی آخر انسان ہوں۔ کئی باتیں بہت بُری ہوں گی۔"

"ارے میاں جاؤ۔ بات کیا ہو رہی تھی اور کیا لے بیٹھے۔" پروفیسر داؤد جھلا اُٹھے۔

"اِس میں ان کا بھی کوئی قصور نہیں۔ حالات ہی کچھ ایسے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"حالات۔ کیا مطلب۔ یہ حالات کہاں سے ٹپک پڑے۔" خان رحمان چونکے۔

"ان بے چارے حالات کو ٹپک پڑنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ٹپکے ٹپکائے رہتے ہیں یہ تو۔"

"بات بھی تو پتا چلے۔"

"یوں پتا نہیں چلے گا۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید نے وہ خط جیب سے نکال کر ان کے آگے کر دیا۔ خان رحمان نے جلدی سے خط لے لیا۔ ساتھ ہی پروفیسر داؤد بھی خط پر جھکے۔ دونوں کے سر جو ٹکرائے تو ان کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا:

"ارے!"

"یہ ارے کس خوشی میں؟

"ہم یہ سمجھتے تھے۔ کہ ناریل صرف ہمارے ہی ٹکراتے ہیں۔ لیکن آج تو ہم نے۔"

"خاموش۔" انسپکٹر جمشید نے انہیں ڈانٹا۔

"نہیں بھئی۔ کہنے دو۔ ہم بُرا نہیں مانتے۔" پروفیسر داؤد مسکرائے۔

"آپ نہ مانیں۔ مجھے تو بُرا لگ رہا ہے۔"

"اوہو اچھا۔ ہمیں نہیں معلوم تھا۔" خان رحمان نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ آپ خط پڑھ رہے ہیں یا اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے ہیں۔" فرزانہ مسکرائی۔

"فاروق کی موجودگی میں اور اِدھر اُدھر کی باتیں نہ ہوں۔ ہو ہی نہیں سکتا۔" خان رحمان بولے۔

"تو میں یہاں سے چلا جاتا ہوں انکل۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ تمہارے بغیر تو کسی بھی تقریب میں مزا نہیں آتا۔" خان رحمان نے کہا۔

"اوہو اچھا۔ کمال ہے۔" فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔

لیکن ادھر پروفیسر داؤد اور خان رحمان پر چپ سوار ہو

گئی، کیوں کہ وہ خط کے الفاظ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ آخر خط ختم کر کے خان رحمان بولے:

"نہیں۔ آج ۱۰ ہی تو ہے شاید۔"

"شاید نہیں انکل۔ یقیناً۔" فرزانہ مسکرائی۔

"اور ہم ان لوگوں کو وہاں لے جا رہے ہیں۔" پروفیسر داؤد ہکلائے۔

"خیر وہاں لے جانے میں تو کوئی حرج نہیں۔ بس صرف اتنا بتا دیں۔ کہاں لے جا رہے ہیں اور کیوں لے جا رہے ہیں؟" انسپکٹر جمشید نے فوراً کہا۔

"بات دراصل یہ ہے بھئی۔" پروفیسر داؤد کہتے کہتے رُک گئے۔

"کہیے۔ آپ رُک کیوں گئے؟"

"کیا کروں۔ کہا نہیں جاتا۔ یار خان رحمان۔ ذرا تم ہی بتا دو۔"

"ضرور کیوں نہیں۔ یہ کیا مشکل کام ہے۔ میں بتائے دیتا ہوں۔ بات دراصل یہ ہے جمشید کہ۔" ان الفاظ کے بعد وہ بھی کچھ نہ کہہ سکے۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ تمہاری گاڑی بھی اٹک گئی۔"

"ان گاڑیوں میں یہی تو بڑی بات ہے۔"

"ہو گی۔ آپ گاڑیوں کی بات چھوڑیں۔ اس جگہ کی بات کریں۔ جہاں ہمیں لے جا رہے ہیں۔"

"دراصل ہم آپ کو کنور لیاقت کے ہاں لے جا رہے ہیں۔"

"کیا کہا۔ کنور لیاقت۔ وہ مشہور و معروف آدمی۔ سنا ہے۔ بہت بڑا آدمی ہے۔ ہر لحاظ سے بڑا۔ شہر میں اس کی حیثیت بھی بہت زیادہ ہے۔ انتظامیہ پر بھی اثر رکھتا ہے، لوگوں کے کام کرا دیتا ہے۔"

"جی ہاں۔ وہی۔ آج اس کے ہاں ایک دعوت ہے۔ اس دعوت میں مجھے اور پروفیسر صاحب کو بھی بلایا گیا ہے۔"

"لیکن۔ ہمیں تو نہیں بلایا گیا۔ تم ہمیں کیوں لے جا رہے ہو۔" انسپکٹر جمشید کے لہجے میں حیرت تھی۔

"یہی تو وہ عجیب بات ہے۔ جو ہم بتاتے ہوئے گھبرا رہے ہیں۔" خان رحمان نے کہا۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ بات بتاؤ۔" انسپکٹر جمشید بولے۔ ان کی دل چسپی بھی اب بہت بڑھ گئی تھی۔ آخر خان رحمان بولے:

"مجھے بھی آج صبح ایک خط ملا تھا۔ کوئی رات کے وقت دروازے کے اندر سرکا گیا تھا۔ صبح سویرے جب میں

سیر کے لیے نکلا، اسی وقت وُہ لفافہ میری نظر پڑا۔ اِس
میں ایک پیغام تھا۔ کیا میں پیغام کے الفاظ دہراؤں
وُہ بولے۔
"اگر وُہ خط تمھارے پاس ہے تو خط دکھا دینا زیادہ بہ
ہے۔"
"ہاں! تاکہ ہم ایک بار پھر ناریلوں کے ٹکرانے کی آواز سُ
سکیں۔" فاروق نے منہ بنایا۔
"میرے پاس وُہ خط ہے۔"
یہ کہہ کر انھوں نے خط نکال کر ان کی طرف بڑھا دیا۔
انھوں نے پڑھا، لکھا تھا:
"ڈیر خان رحمان۔ آج شام آپ کنور لیاقت کے ہاں
دعوت میں جا رہے ہیں، لیکن یہ دعوت ایک خُونی
دعوت ہو گی۔ اس دعوت کو خُونی دعوت بننے سے
بچانا ہے تو آپ اپنے ساتھ اپنے دوست انسپکٹر
جمشید اور ان کے بچّوں کو لے کر آنا۔ فقط:
کالا چور۔"
خط پڑھ کر انھوں نے ایک دُوسرے کی طرف دیکھا۔
تحریر اسی ہاتھ کی تھی۔ اب وُہ خان رحمان کی طرف مڑے۔
"کیا آپ جانتے ہیں انکل۔ کالا چور کون ہے؟"

"میرے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم۔" انھوں نے منہ بنایا۔
"پھر تم ہمیں وہاں لے جانے کے لیے اتنی جلدی کیوں
کر رہے تھے؟"
"وُہ جلدی تمھیں ساتھ لے جانے کے لیے نہیں۔ خود وقت
پر پہنچنے کے لیے کر رہے تھے، کیوں کہ ہم ہر جگہ مقررہ وقت
پر پہنچنے کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں اور کہیں ایک منٹ
بھی لیٹ نہیں پہنچتے۔"
"یہ بات تو خیر ہے۔" وُہ مُسکرائے۔
"لیکن اب یہ بات بالکل ظاہر ہو گئی کہ وہاں کی دعوت
خُونی دعوت نہیں ہو گی۔ ہاں! وہاں کوئی جرم کرنے کی
کوشش ضرور کی جائے گی۔ اور وُہ جرم کیا ہو گا۔ یہ ہمیں
معلوم نہیں۔"
"خیر۔ اب ہم جا کر ہی رہیں گے۔ اور یہ معلوم کر کے
رہیں گے کہ وہاں کیا جرم ہونے والا ہے۔ یا یہ کہ جرم
کون کرنے والا ہے۔"
"اس کا مطلب ہے۔ ایک عدد کیس پلّے پڑ گیا ہے۔"
فاروق نے سرد آہ بھری۔
"تم آخر کیسوں کے پلّے پڑنے سے اتنا گھبراتے کیوں
ہو؟" محمود نے منہ بنایا۔

"ہاں ! اور کیا۔ ہمیں تو کہنا چاہیے۔ کیسوں سے ڈرنے والے اے آسمان نہیں ہم۔" فرزانہ نے چہکتی آواز منہ سے نکالی۔

اور اُن کی کار چل پڑی۔

"ہمیں یہ بات معلوم نہیں کہ کیا جرم وہاں ہو گا۔ اور نہ یہ معلوم کہ کون کرے گا، لیکن ہمیں ایک بات ضرور معلوم ہے۔" انسپکٹر جمشید نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔

"جی۔ وہ کیا؟" تینوں ایک ساتھ بولے۔

"یہ کہ۔ وہاں کوئی جرم ہونے والا ہے۔" وہ مسکرائے۔

"جی ہاں۔ یہ تو معلوم ہے۔ تو پھر۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"اگر ہم دعوت رکوا دیں۔ تو کیا خیال ہے؟"

"کیا آپ کے خیال میں دعوت رکوا دینے سے مجرم جرم کرنے سے رک جائے گا؟"

"ہاں ! اس کا امکان ہے۔"

"خیر۔ یہ کوشش بھی کر کے دیکھ لیں۔ لیکن ابا جان۔" محمود کہتے کہتے رک گیا۔

"ہاں کہو۔ میں سن رہا ہوں۔" وہ بولے۔

"وہ کسی اور تقریب میں اپنا کام کر گزرے گا۔ لہٰذا کیوں

نہ ہم یہیں اسے روک دیں۔ وہ جرم کرنے ہی نہ پائے۔" محمود نے پُر جوش انداز میں کہا۔

"تمھاری بات پسند آئی۔ لیکن روک تو ہم اس صورت میں سکتے ہیں نا۔ جب ہمیں معلوم ہو کہ کیا جرم ہونے والا ہے۔ کسی آدمی کو ہلاک کیا جانے والا ہے یا تقریب میں کوئی بم وغیرہ پھٹنے کا امکان ہے۔ یا اس قسم کی کوئی اور بات ہے۔ ان میں سے کوئی ایک بات بھی معلوم ہو۔ ہم کچھ نہ کچھ کر سکتے ہیں، لیکن جب تک ہمیں کچھ معلوم نہ ہو، کچھ نہیں کر سکتے۔"

"گویا کسی طرح ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کیا جرم کرنا چاہتا ہے۔"

"ہاں ! اگر ہم نے یہ معلوم کر لیا تو پھر میدان ہمارے ہاتھ ہو گا۔" فرزانہ نے جلدی سے کہا۔

"ابھی ہم اصل جگہ پہنچے نہیں اور میدان کے ہاتھ میں ہونے کی باتیں ہونے لگیں۔" فاروق نے بُرا سا منہ بنایا۔

"ہر کام کا پہلے ذہنی جائزہ لیا جاتا ہے۔ پھر عملی قدم اُٹھایا جاتا ہے۔ ہم اس وقت صرف ذہنی لحاظ سے جائزہ لے رہے ہیں۔ اصل صورتِ حال کا اندازہ وہاں پہنچ کر لگانے کی کوشش کریں گے۔"

آدھ گھنٹے تک کار چلتی رہی۔ آخر ایک عظیم الشان کوٹھی کے سامنے رک گئی۔ کاریں پارک کرنے کے لیے ایک طرف جگہ بنائی گئی تھی۔ دو ملازم فوراً کار کی طرف بڑھے۔ ان میں سے ایک نے کہا:

"کار اس طرف لے چلیے۔"

کار پارک کر کے وہ نیچے اُترے اور گیٹ کی طرف آئے:

"جمشید۔ کنور لیاقت کو جانتے ہو؟"

"صرف اخبارات کی حد تک۔ ذاتی طور پر کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔"

"وہ دیکھو۔ دروازے پر کھڑا مہمانوں کا استقبال کر رہا ہے۔"

اُنھوں نے اس طرف دیکھا۔ وہ ایک سڈول سا آدمی تھا۔ قد قدرے لمبا تھا۔ رنگ سانولا۔ آنکھوں میں ہلکی سی زردی۔ اور گہری سوچ میں گم معلوم ہوتی تھیں۔ وہ بہت خوش اخلاقی سے مہمانوں سے ہاتھ ملا رہا تھا اور انھیں اندر چلنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ آخر وہ بھی گیٹ تک پہنچ گئے:

"اوہو۔ خان رحمان۔ اور پروفیسر داؤد۔"

اس کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔ نظریں انسپکٹر جمشید

پر جم کر رہ گئیں۔ اس کی آنکھوں میں شدید اُلجھن کے آثار نظر آنے لگے۔ یہ بات وہ بھی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے۔

"خیر تو ہے کنور صاحب۔ آپ خاموش ہو گئے؟"

"خان رحمان۔ اور پروفیسر داؤد۔ یہ آپ کے ساتھ کون لوگ ہیں؟"

"کیوں۔ کیا آپ انھیں نہیں جانتے؟" خان رحمان کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ انسپکٹر جمشید اور یہ ان کے بچے ہیں، لیکن یہاں ان کا کیا کام؟"

محمود، فاروق اور فرزانہ کے رنگ اڑ گئے۔ خان رحمان اور پروفیسر داؤد بھی دھک سے رہ گئے، لیکن انسپکٹر جمشید کا رنگ ذرا بھی تبدیل نہیں ہوا۔ انھوں نے مسکرا کر کہا:

"یہ بات خان رحمان اور پروفیسر صاحب کو معلوم ہے کہ یہاں ہمیں نہیں بلایا گیا۔ اور بن بلائے کسی دعوت میں شریک ہونا اسلام کی رُو سے بھی بالکل غلط ہے۔ جدید تہذیب بھی اس کو پسند نہیں کرتی۔ ہم بھی اس بات سے اچھی طرح باخبر ہیں، لیکن اس کے باوجود ہمیں یہاں آنا پڑا۔ لیکن ۔۔" وہ یہاں تک کہہ کر رُک گئے۔

"میں کوئی لیکن ویکن سُننے کے لیے تیار نہیں۔ آپ چاروں
کو یہیں سے لوٹنا ہو گا۔ آپ میرے لیے ناپسندیدہ ترین
انسان ہیں۔" کنور لیاقت نے کہا۔
"کنور لیاقت۔ آپ ہوش میں تو ہیں۔" خان رحمان کو
غصّہ آگیا۔
"ایک منٹ خان رحمان۔ ابھی میں نے اپنی بات مکمل
نہیں کی۔ ہاں تو کنور صاحب۔ اس میں کوئی شک نہیں
کہ خان رحمان واقعی آپ کے دوست اور ہمدرد ہیں۔ یہ
دیکھیے۔ انھیں یہ گمنام خط ملا تھا۔" یہ کہہ کر انھوں نے
ان کے والا خط کنور کے آگے کر دیا۔ کنور نے خط لے کر
جلدی جلدی پڑھا اور پھر اس کی آنکھوں میں اور اُلجھن
گئی۔ اچانک اس نے مسکرا کر کہا:
"یہ۔ یہ کسی کا مذاق بھی ہو سکتا ہے۔"
"تو پھر یہ دیکھیے۔" انھوں نے اپنے والا خط نکال کر اسے
دے دیا۔
اب اس نے وہ خط پڑھا ... پر حیرت دوڑ
گئی اور ساتھ میں ہلکا سا خوف ... چند سیکنڈ تک
سوچنے کے بعد اس نے کہا:
"اس کے باوجود آپ لوگ ... سکتے۔ میں آپ

لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔ ایسے افراد میری دعوت میں کس
طرح شرکت کر سکتے ہیں۔ جن کو میں پسند ہی نہیں کرتا۔"
"آپ ان الفاظ کے باوجود مجھے غصّہ دلانے میں کامیاب
نہیں ہوئے مسٹر کنور۔" انسپکٹر جمشید دل کش انداز میں مسکرائے، حالانکہ
محمود، فاروق اور فرزانہ کا مارے غصّے کے بُرا حال تھا۔
"ہاں! اس پر مجھے بھی حیرت ہے۔ خیر۔ آپ جا سکتے
ہیں۔"
"اگر یہ جائیں گے تو پھر ہم بھی جائیں گے۔" پروفیسر
داؤد نے اعلان کیا۔
"بالکل!" خان رحمان بولے۔
"تم پھر بولے خان رحمان۔ ابھی میں نے بات
مکمل نہیں کی۔" انھوں نے منہ بنایا۔
"تو بات مکمل کر لو جمشید۔ لیکن ذرا جلدی۔ اب مجھ
سے یہاں رکا نہیں جا رہا۔" انھوں نے کہا۔
"ان دو خطوں کے پڑھنے کے بعد بھی آپ یہ چاہتے
ہیں کہ ہم یہاں سے چلے جائیں۔"
"ہاں۔ بالکل۔ میں یہی چاہتا ہوں۔"
"لیکن جناب ہم نہیں جائیں گے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔
"کیا کہا۔ آپ نہیں جائیں گے۔" کنور لیاقت دھک

سے رہ گیا۔

"ہاں! ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔ جب تک کہ دعوت ختم نہیں ہو جاتی۔ اس لیے کہ یہاں ایک عدد جرم ہونے والا ہے۔ نہ جانے جرم کس نوعیت کا ہو گا۔ اس سے کسی ایک آدمی کو خطرہ ہے یا سب لوگوں کو۔ ہم اندر دعوت کھانے نہیں۔ سب کو اس جرم سے بچانے کے لیے جائیں گے۔ کیا آپ اب بھی انکار کریں گے۔"

"ہاں بالکل۔ میرے پاس انکار کی بہت بھاری وجہ ہے۔"

"ہم وہ وجہ ضرور سنیں گے جناب۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"آپ لوگ جہاں بھی جاتے ہیں۔ وہاں کوئی نہ کوئی چکر چل کر رہتا ہے۔ لہٰذا یہاں اگر کوئی چکر نہ بھی چلنا ہوا، تو بھی آپ لوگوں کی آمد چکر چلوا کر چھوڑے گی۔"

"بھئی واہ۔ یہ بات تو آپ نے ٹھیک کہی۔" فاروق بول اٹھا۔

"ٹھیک کہی نا۔ دیکھیے۔ خود آپ کے ساتھی یہ بات تسلیم کر رہے ہیں۔"

"ہاں! ہو سکتا ہے۔ یہی بات ہو۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے یہاں داخل ہونے سے پہلے ہمیں یہ دو خطوط

موصول ہو چکے ہیں۔ اور ہم ان خطوط کی روشنی میں یہاں کا معائنہ کرنا ازحد ضروری خیال کرتے ہیں اور ہمیں اس کام سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

"میں روکوں گا۔" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"آؤ بھئی۔ خان رحمان۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور اندر کی طرف بڑھے۔

"رک جائیے، ورنہ میرا ہاتھ اٹھ جائے گا۔" کنور لیاقت چلایا۔

انھوں نے جیسے سنا ہی نہیں۔ انسپکٹر جمشید کے پیچھے خان رحمان، پروفیسر داؤد اور پھر وہ تینوں بھی داخل ہو گئے۔ اور کنور لیاقت بت بنا کھڑا رہا۔ پھر اس نے جلدی سے اپنی جگہ سے حرکت کی اور فون کی طرف جھپٹا۔ کسی کو جلدی جلدی فون کیا اور پھر اپنے ملازموں سے بولا:

"ان کے پیچھے لگے رہو۔ نظریں ان پر رکھو۔ میں ابھی اندر آتا ہوں۔"

"جی بہتر۔" چار ملازم ایک ساتھ بولے اور اندر کی طرف دوڑ گئے۔

نیلا چاند

اندر ایک طرف لان میں مہمان جمع تھے۔ رنگین کرسیاں
بچھی تھیں۔ درمیان میں میزیں رکھی گئی تھیں۔ کچھ لوگ چہل
قدمی کر رہے تھے، کچھ کرسیوں پر بیٹھے خوش گپیوں میں
معروف تھے۔

انسپکٹر جمشید نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور سیدھے
اندر کی طرف بڑھے۔

"جمشید۔ یہ کنور لیاقت بہت بڑا آدمی ہے۔ اور ہم
غیر قانونی طور پر اندر داخل ہو رہے ہیں۔" خان رحمان
نے پریشان ہو کر کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ پروا نہ کرو۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا کہا۔ پروا نہ کروں۔" خان رحمان نے حیرت زدہ
انداز میں کہا۔

"ہاں! پروا نہ کرو۔" وہ بولے۔

"لیکن۔ وہ ضرور کوئی طوفان اٹھائے گا۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہم اس طوفان سے ضرور ٹکرائیں گے۔"

برامدے میں داخل ہوتے ہی انہیں دائیں طرف
ایک کمرے کا دروازہ کھلا نظر آیا۔ اندر ایک صاحب بستر
پر لیٹے ہوئے کچھ گنگنا رہے تھے۔ وہ بے دھڑک اس
کمرے میں داخل ہو گئے اور پھر جلدی سے کرسیوں پر
بیٹھ گئے۔

"کک۔ کیا مطلب؟" وہ گنگنانا بھول گیا اور انہیں گھورنے
لگا۔

"کس بات کا مطلب پوچھا آپ نے؟" محمود بولا۔

"آپ کون ہیں اور میرے کمرے میں بلا اجازت
کیوں داخل ہوئے ہیں؟"

"آپ کے کمرے کا ہی کیا ذکر۔ ہم تو اس کوٹھی میں
بھی بغیر اجازت داخل ہوئے ہیں۔" فاروق مسکرایا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کنور صاحب تو بہت با اصول
آدمی ہیں۔ کوئی ان کی کوٹھی میں بغیر اجازت کس طرح
داخل ہو سکتا ہے۔"

"جی بس۔ ہم تو داخل ہو ہی گئے۔"

"آخر آپ ہیں کون اور اب مجھے کیوں پریشان کرنے چلے

آئے ہیں۔" اس نے جھلا کر کہا۔

اسی وقت تیز قدموں کی آواز گونجی اور پھر کمرے کے دروازے پر چار ملازم نمودار ہوئے:

"یہ سب کیا ہے بھئی۔ یہ کون لوگ ہیں؟"

"یہ لوگ زبردستی کوٹھی میں داخل ہوئے ہیں۔ ہم ان کی نگرانی کریں گے جب تک کہ کنور صاحب پولیس کے ساتھ ان تک نہیں پہنچ جاتے۔"

"سن لیا آپ لوگوں نے۔" اس نے کہا۔

"ایسی باتیں تو ہم ہر روز ہی سنتے ہیں۔ آپ یہ بتائیں، نام کیا ہے آپ کا؟"

"میں کیوں بتاؤں آپ کو نام۔ کیا ضرورت ہے مجھے نام بتانے کی؟" اس نے جل کر کہا۔

"خیر۔ ہم آپ کو مسٹر گمنام کہہ کر پکار لیتے ہیں۔" محمود نے کندھے اچکائے۔

"خبردار۔ میرا نام گمنام نہیں ہے۔" وہ چلایا۔

"تو پھر کیا ہے؟"

"افراسیاب۔" اس نے یک دم کہا۔

"نام تو بہت زوردار ہے۔"

"گھمن صاحب۔ کیا ہم ان لوگوں کو باہر نکال دیں؟" ایک

ملازم بول اٹھا۔

"ہاں بالکل۔ میں بن بلائے مہمانوں کو پسند نہیں کرتا۔"

"آپ نے ان کا کیا نام لیا۔ گھمن صاحب۔ لیکن انہوں نے تو اپنا نام افراسیاب بتایا ہے۔" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں! میرا اصل نام افراسیاب گھمن ہے۔" اس نے جل کر کہا۔

"اوہ۔ شکریہ مسٹر افراسیاب گھمن صاحب۔ کیا آپ مہمانوں کے ساتھ دعوت میں شریک نہیں ہوں گے۔"

"کیوں نہیں ہوں گا۔ اور یہاں آیا کس لیے ہوں۔"

"لیکن مہمان تو لان میں ہیں۔" فاروق نے کہا۔

"ابھی تقریب شروع ہونے میں بہت دیر ہے۔ میں سفر کر کے آیا ہوں، اس لیے پارٹی سے پہلے کچھ آرام کر لینا چاہتا ہوں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آرام میری قسمت میں نہیں۔"

"نہیں نہیں۔ ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ آپ شوق سے۔"

انسپکٹر جمشید کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔ اسی وقت بھاری قدموں کی آواز سنائی دی تھی۔ انھوں نے مڑ کر دیکھا۔ کنور لیاقت چلے آ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر شدید غصے کے آثار تھے:

"اوہ۔ تو آپ لوگ یہاں ہیں۔"
"ہاں! یہاں سے فارغ ہوں گے تو کہیں اور جائیں گے
نا۔" فاروق بولا۔
"مسٹر گھمن۔ ان لوگوں نے آپ کو پریشان تو نہیں کیا؟"
"پریشان کرنے کی کوشش ضرور کر رہے تھے۔" گھمن بولا۔
"خیر۔ آپ فکر نہ کریں۔ پولیس آیا ہی چاہتی ہے۔ ہم
ان سے نبٹ لیں گے۔"
"نبٹنے سے پہلے ہم ان سے چند باتیں پوچھنا چاہتے ہیں،
اگر آپ پسند کریں۔" انسپکٹر جمشید سرد آواز میں بولے۔
"کیسی باتیں۔ آخر ہم آپ لوگوں کی باتوں کا جواب
کیوں دیں۔" کنور لیاقت نے کہا۔
"ہم آپ کو وہ خط دکھا چکے ہیں۔ اس کے باوجود
آپ ہمارے ساتھ قطعاً تعاون کرنے کے لیے تیار نہیں۔
آخر اس سے ہم کیا سمجھیں۔"
"جو جی میں آئے سمجھیں۔" اس نے کہا۔
"تب پھر ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ جرم آپ ہی کرنے
والے ہیں۔ اسی لیے تو ہمیں یہاں ٹکنے نہیں دے رہے تھے۔"
"اگر وہ مجرم میں ہوں تو یہ بات آپ کو ثابت کرنا
ہو گی۔"

"ثابت کرنے کے لیے ہی تو اندر داخل ہوئے ہیں۔ لیکن
آپ ہم سے کوئی تعاون ہی نہیں کر رہے۔"
"اس لیے کہ نہ تو یہاں کوئی مجرم ہے اور نہ کوئی جرم
ہو گا۔ آپ سے کسی نے مذاق کیا ہے اور آپ ہمیں پریشان
کرنے آ گئے ہیں۔ اور پوری دعوت کو درہم برہم کر کے رکھ
دیں گے۔ میں آپ لوگوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔" کنور
لیاقت نے جلدی جلدی کہا۔
"پوری دعوت درہم برہم ہو جائے۔ یہ اس سے بہتر
ہے کہ یہاں کوئی جرم ہو۔"
"اور میں کہتا ہوں۔ یہاں دُور دُور تک کسی جرم کا کوئی
امکان نہیں۔"
"ہمیں پوری کوٹھی کا جائزہ لے لینے دیں۔ پھر آپ کو امکان
ہی امکان نظر آنے لگیں گے۔"
"نہیں۔ میں یہ معاملہ پولیس کے حوالے کروں گا۔ آپ لوگوں
کے نہیں۔ پولیس میری دعوت کو خراب نہیں کرے گی۔"
"کیا آپ اتنا بھی نہیں بتا سکتے کہ یہ دعوت کس سلسلے میں
دی گئی ہے۔"
"یہ تو میں بتا دیتا ہوں جمشید۔" خان رحمان بولے۔
"خان رحمان اور پروفیسر داؤد صاحبان۔ آپ لوگوں سے مجھے

ایسی امید نہیں تھی کہ میری دعوت میں افراتفری مچانے کے لیے انھیں ساتھ لائیں گے۔"

"اگر آپ انھیں خوش آمدید کہتے اور انھیں کوٹھی کا جائزہ لینے کی اجازت خود دے دیتے تو کسی افراتفری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، لیکن آپ نے انھیں اجازت نہیں دی، اس وجہ سے یہ صورتِ حال پیدا ہوئی۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"آپ نہیں جانتے۔ یہ جہاں بھی جاتے ہیں۔ وہیں کوئی چکر چل جاتا ہے۔" کنور لیاقت بولا۔

"یہ بات اور ہم نہ جانیں گے۔ ارے میاں جاؤ۔" پروفیسر داؤد جل گئے۔

اسی وقت بہت سے قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر پولیس کمرے میں داخل ہوگئی۔

"کیا معاملہ ہے جناب کنور لیاقت؟" پولیس انسپکٹر نے باادب ہو کر کہا۔

"یہ لوگ زبردستی میری کوٹھی میں گھس آئے ہیں۔" اس نے ان چاروں کی طرف اشارہ کیا۔

"ارے۔ یہ تو انسپکٹر جمشید ہیں۔" انسپکٹر حیرت زدہ رہ گیا۔

"تو کیا ہوا۔ کیا انسپکٹر جمشید ہر کسی کے گھر میں داخل ہونے

کا اختیار رکھتے ہیں۔"

"م۔ میں۔ میں۔" انسپکٹر ہکلانے لگا۔

"آپ کیا میں میں کر رہے ہیں۔ کھل کر بات کریں۔"

"میرے خیال میں ایسا اختیار تو انھیں نہیں ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔

"ہاں انسپکٹر صاحب۔ آپ نے ٹھیک کہا، لیکن اگر کسی گھر میں مجھے جرم کی کوئی اطلاع ملے۔ میں اس گھر میں دخل دے سکتا ہوں۔ یہ اختیار مجھے دیا گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" کنور لیاقت نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ رہا میرا اجازت نامہ۔" انھوں نے کہا۔

اجازت نامہ پڑھ کر کنور لیاقت سست پڑ گیا۔ انسپکٹر تو پہلے ہی گھبرایا ہوا تھا۔

"اب آپ کیا کہتے ہیں کنور صاحب؟

"اب میں وزیرِ اعلیٰ سے بات کروں گا۔"

"کچھ نہیں ہوگا جناب۔ ہمیں اپنا کام کرنے دیں۔ ایسا نہ ہو۔ مجرم جرم کر کے صاف نکل جائے گا اور اپنے دعوے میں سچا ثابت ہو جائے۔"

"دعویٰ۔ مجرم۔ یہ سب کیا ہے جناب؟" انسپکٹر نے حیران ہو کر کہا۔

انھوں نے خط انسپکٹر کو دے دیے۔ خط پڑھ کر وہ بولا:

"ان حالات میں تو یہ حضرات آپ کی بھلائی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ حیرت ہے۔ آپ ان کے راستے میں رکاوٹ کیوں بن رہے ہیں؟" انسپکٹر نے حیران ہو کر کہا۔

"یہی بات انھیں ہم نے کہی تھی۔" محمود بولا۔

"آپ سب ایک منہ ہو گئے۔ خیر کر لیں جو کرنا ہے۔" اس نے جھنجھلا کر کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ اس کے چاروں ملازم بھی چلے گئے۔

"یہ دعوت کس سلسلے میں دی گئی ہے خان رحمان؟"

"آج سے سولہ سال پہلے کنور لیاقت کی بیٹی اغوا کر لی گئی تھی۔" خان رحمان نے بتانا شروع کیا۔

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

"سولہ سال بعد اغوا کرنے والا شخص اسے واپس کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اور وہ آج اسے لے کر آ رہا ہے۔"

"کمال ہے۔ سولہ سال بعد اسے کیا خیال آ گیا؟"

"سنا ہے۔ اس نے ایسا انتقامی کارروائی کی بنا پر کیا تھا۔ وہ شخص اپنی بیوی کی بیماری کی وجہ سے دوسروں سے مدد لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ان حالات میں

اس نے کنور لیاقت سے بھی درخواست کی۔ اسے صرف دس ہزار روپے کی ضرورت تھی۔ بیوی کے آپریشن کے لیے، کنور لیاقت نے انکار کر دیا۔ اور ادھر اس کی بیوی مر گئی۔ اس کے کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔ شاید اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا یا غصے نے اس پر قابو پا لیا۔ بس اس نے کنور لیاقت کی چار سالہ بیٹی کو اغوا کر لیا۔ اس روز کے بعد اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ سولہ سال بعد اس نے خود ہی کنور لیاقت کو خط لکھا۔ اور پرانی کہانی یاد دلائی، پھر آخر میں لکھا کہ وہ اس دنیاوی زندگی کی بجائے اب اللہ سے لو لگا چکا ہے۔ لہٰذا اس کی بیٹی واپس کرنے کے لیے آ رہا ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس کا جرم معاف کر دیا جائے اور اس کا اعلان اخبارات کے ذریعے کرا دیا جائے۔ اور کنور لیاقت اخبارات میں یہ اعلان کرا چکا ہے۔ اس نے اس کے لیے عام معافی کا اعلان کر دیا ہے۔ بلکہ بیٹی کی واپسی کے صلے میں اسے انعام اور اکرام سے نوازنے کا بھی وعدہ کیا ہے۔"

"اور اس شخص کے پاس کیا ثبوت ہو گا کہ جس بچی کو وہ لے کر آئے گا۔ وہ کنور صاحب کی ہی ہو گی۔"

محمود نے جلدی سے کہا۔

"اخبارات کے ذریعے کنور صاحب نے بھی اس سے یہ سوال کیا تھا۔ جس کا جواب اس نے یہ دیا کہ ثبوت وہ ساتھ لائے گا۔ جو ناقابلِ تردید ہوگا۔"

"ہوں۔ ان حالات میں تو ہم اس گھر میں جرم کی بُو سونگھ سکتے ہیں۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"گویا دعوت اس بچی اور اس کے اغوا کرنے والے کی آمد کے بعد ہوگی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی بالکل۔"

"اور کنور لیاقت کے اور کتنے بچے ہیں؟"

"ایک بھی نہیں۔ وہ پہلی بچی تھی۔ اس کے غم میں اس کی ماں مر گئی تھی، پھر کنور لیاقت نے دوسری شادی کر لی۔ دوسری شادی سے ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔" خان رحمان نے بتایا۔

"پھر تو ہم مسٹر افراسیاب کو بلاوجہ پریشان کر رہے ہیں۔ ہمیں تو لان میں چلنا چاہیے۔ تاکہ کنور صاحب کی بیٹی کی آمد کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اب میں سمجھا۔ کنور صاحب کس لیے ہماری آمد پر

پریشان ہو گئے تھے۔ دراصل وہ خوف زدہ ہیں کہ کہیں ہم ان کی بیٹی کو نقلی نہ ثابت کر دیں اور وہ بیٹی کو پاتے پاتے نہ رہ جائیں۔" محمود نے کہا۔

"ہُوں۔ یہ بات بھی ہو تو سکتی ہے۔"

عین اسی وقت زور دار آواز والا آلارم بجنے لگا:

"یہ۔ یہ ان کی بچی کے آنے کا اعلان ہے۔ مہمانوں کو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا۔" افراسیاب گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر باہر کی طرف دوڑا۔

وہ بھی اس کے پیچھے لپکے اور آن کی آن میں باقی لوگوں تک پہنچ گئے۔ اب سب لوگ گیٹ کے باہر پہنچ چکے تھے۔ اور دُور سے آتی ایک سرخ رنگ کی کار کو دیکھ رہے تھے۔

"اغوا کرنے والے کے پاس یہ سُرخ کار کہاں سے آ گئی۔ وہ تو ایک غریب آدمی تھا۔" فارُوق بولا۔

"یہ کار اپنے ڈرائیور کے ذریعے کنور صاحب نے چونگی کے پاس بھیجی تھی۔ اغوا کرنے والے نے انھیں بتا دیا تھا کہ وہ چونگی کے پاس ویگن سے اُترے گا۔ وہاں ایک کار اور ڈرائیور موجود ہو۔ ڈرائیور کے علاوہ کوئی اور نہ ہو۔ باقی سب لوگ گھر میں ہی ٹھہر کر

انتظار کریں۔ اس طرح لوگوں میں تماشا بننے سے بچیں گے،
کنور لیاقت نے اس کی ہر بات کو فوراً مان لیا تھا۔"
ایک میزبان نے دبی آواز میں بتایا۔

اسی وقت سُرخ کار دروازے کے پاس آ کر رک
گئی۔ کنور لیاقت ہاتھوں میں دو ہار لیے سب سے آگے
کھڑا تھا۔ کار رُکتے ہی وُہ تیزی سے آگے بڑھا۔ کار
کا دروازہ کُھلا۔ پہلے ڈرائیور باہر نکلا، پھر اس نے پچھلا
دروازہ کھولا۔ ایک نوجوان لڑکی اور ایک ادھیڑ عُمر آدمی
باہر نکل آئے۔ ادھیڑ عُمر آدمی کے ہاتھ میں ایک رُومال
تھا۔

"میں آپ دونوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ آج کا دن
کس قدر خوشی کا دن ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک
ایک ہار دونوں کے گلے میں ڈال دیا۔ پھر لڑکی کو اپنے
گلے سے لگا لیا۔ وُہ بے تحاشہ انداز میں رو رہی تھی۔
ادھر ادھیڑ عمر آدمی بُت بنا کھڑا تھا۔ اکثر لوگوں کی
آنکھوں میں اس کے لیے نفرت ہی نفرت تھی اور اس بات کو
وُہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"آئیے موجو بھائی۔" کنور نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ
دیا۔ پھر وُہ اندر کی طرف چل پڑے۔ لان میں آ کر سب

کُرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"اب پہلے کھانے کی چیزوں سے انصاف کر لیا جائے۔"
کنور لیاقت نے کہا۔

"کیا آپ پہلے ثبوت طلب نہیں کریں گے؟" انسپکٹر جمشید
کے لہجے میں حیرت تھی۔

"مسٹر انسپکٹر جمشید۔ آپ نہ بولیں۔ آپ بن بلائے مہمان
ہیں۔" کنور لیاقت بھنّا اُٹھا۔

"بہت بہتر۔ لیکن اتنا تو مَیں اب بھی کہوں گا۔ کیا آپ
ثبوت نہیں مانگیں گے؟"

"یہ دونوں کہیں بھاگے نہیں جا رہے۔ ثبوت لینے میں
کیا دیر لگتی ہے۔ پہلے اس خوشی میں دعوت تو اڑا لی
جائے۔" کنور لیاقت نے جھلّا کر کہا۔

"لیکن ایسا نہ ہو۔ آپ کی خوشی کافور ہو جائے۔"

"اللہ نہ کرے۔ آپ کیوں ایسی بات منہ سے نکالتے
ہیں۔" اس نے تلملا کر کہا۔

"اچھا۔ آپ کی مرضی۔" اُنھوں نے کندھے اُچکا دیے۔
سب لوگ کھانے پینے میں مصروف ہو گئے۔ بس وُہ
الگ تھلگ بیٹھے رہے۔ ایسے میں انسپکٹر جمشید بولے:
"پروفیسر صاحب۔ آپ اور خان رحمان تو ان کے ساتھ

کھانے میں شریک ہو جائیں۔ آپ کو تو دعوت دی گئی
ہے۔"

"نہیں! تمھارے بغیر کھانے کا کیا مزا آئے گا۔" پروفیسر
بولے۔

"بالکل نہیں آئے گا۔" خان رحمان نے کہا۔

اسی وقت کنور لیاقت اُٹھ کر اُن کی طرف آ گیا:

"آپ دونوں کیوں نہیں چلتے؟" وہ بولا۔

"اپنے ساتھیوں کی وجہ سے۔"

"انھیں بھی لے چلیے۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔" اس
نے کہا۔

"نہیں جناب! ہم ایسا کام کبھی نہیں کرتے۔ جب تک
ہماری دعوت نہ ہو، ہم نہیں کھاتے۔ اسلام نے ہمیں
یہی تعلیم دی ہے۔"

"ہوں! جیسے آپ کی مرضی۔" اس نے کندھے اُچکائے اور
پھر مہمانوں کی طرف چلا گیا۔

کھانے پینے کا یہ دور پون گھنٹے تک جاری رہا۔ آخر
سب لوگ دوسری طرف آ بیٹھے اور کنور لیاقت نے اعلان
کرنے کے انداز میں کہا:

"اب ہم ثبوت دیکھیں گے۔ موجو بھائی آپ کے پاس

کیا ثبوت ہے کہ یہ بچی میری ہے؟"

یہ الفاظ سُن کر موجو بھائی کھڑا ہو گیا اور پھر بولا:

"ثبوت دینے سے پہلے میں ایک بار پھر یہ اطمینان
چاہوں گا کہ مجھے قانون کے حوالے نہیں کیا جائے گا،
میرے لیے اس بھرے مجمعے میں عام معافی کا اعلان کیا
جائے۔ اور انعام کا بھی اعلان کیا جائے۔" اس نے ناک
پر رُومال رکھتے ہوئے یہ الفاظ کہے۔ شاید اسے نزلے
کی شکایت تھی۔

"ہاں ضرور۔ کیوں نہیں۔ میں اعلان کرتا ہوں۔ بے شک
میرے یہ الفاظ ریکارڈ کر لیے جائیں۔ میں موجو بھائی کے
خلاف کوئی قانونی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ ایک لاکھ روپے
بطور انعام دے کر اس گھر سے با عزت رخصت کروں گا اور
یہاں سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی پولیس موجو بھائی کو
ہاتھ نہیں لگائے گی۔"

"ایک لاکھ روپے۔ بس۔" موجو بھائی کے منہ سے نکلا۔

"اگر یہ انعام کم ہے تو دو لاکھ سہی۔"

"کنور صاحب۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں آپ کی بچی
کو آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔ کوئی کھلونا تو آپ کے
حوالے نہیں کر رہا۔ دو لاکھ کا تو لوگ اپنی اولاد کے

لیے آج کل کھلونا خرید لیتے ہیں۔"

"اوہ ہاں ۔ مَیں غلط کہ گیا۔ ٹھیک ہے۔ مَیں دس لاکھ روپے کا اعلان کرتا ہُوں۔"

"اگرچہ یہ میری امیدوں کے خلاف ہے، لیکن مَیں اب زیادہ کیا بحث کروں ۔ مجھے دس لاکھ منظور ہیں۔ اب مَیں ثبوت پیش کرتا ہوں ۔ کنور صاحب ۔ جب آپ کی بچّی اغوا ہوئی تھی ۔ اس وقت جو لباس اس کے جسم پر تھا۔ وہ تو آپ کو یاد ہو گا۔"

"ہاں کیوں نہیں ۔ ایک ایک چیز آج بھی میری نظروں کے سامنے گھومتی رہتی ہے۔" کنور نے دُکھ بھرے انداز میں کہا ۔

"شکریہ ۔ مَیں آپ کو وہ لباس دکھاتا ہُوں۔"

یہ کہ کر موجو بھائی جھکا ۔ اس نے سٹول پر ایک پلاسٹک بیگ رکھا ہوا تھا، اس نے اسے کھولا اور بیگ سے دو ننھے ننھے کپڑے نکال کر کنور لیاقت کے چہرے کے سامنے کر دیے ۔

کنور نے ان کپڑوں کو جھپٹ لیا ، پھر کانپتی آواز میں بولا :

"یہ ۔ بالکل وُہی ہیں ۔ بالکل وُہی۔"

"اور کنور صاحب ۔ آپ کو یاد ہو گا ۔ بچّی کے گلے میں سفید موتیوں کا ہار تھا ۔ اس ہار میں ایک لاکٹ بھی پرو دیا گیا تھا ، اس لاکٹ میں بچّی کی تصویر تھی۔"

"ہاں ہاں ۔ اچھی طرح یاد ہے۔"

"اب مَیں وہ ہار آپ کے سامنے پیش کرتا ہُوں۔"

اس نے ایک بار پھر بیگ میں ہاتھ ڈالا اور ایک ہار نکال کر کنور کے سامنے لہرا دیا ۔ کنور نے اس ہار کو بھی جھپٹ لیا اور پھر وہی الفاظ دہرائے :

"وُہی ۔ بالکل وُہی۔"

"اور کنور صاحب ۔ اب مَیں آپ کی خدمت میں وہ جُوتی پیش کرتا ہوں ۔ جو اس وقت بچّی کے پاؤں میں تھی۔"

اب اس نے جوتی نکال کر انہیں دے دی ۔

"یہ بھی وُہی ہے۔"

"لہٰذا ثبوت مکمل ۔ اب آپ اور کیا اطمینان چاہتے ہیں؟"

"کُچھ ۔ کچھ نہیں ۔ مجھے تو پہلے ہی یقین آ گیا تھا، اب مزید اطمینان ہو گیا ۔ آج رات موجو بھائی ۔ تم میرے مہمان رہو ۔ صبح میں بنک سے دس لاکھ روپے نکلوا کر تمہیں باعزت طریقے سے رخصت کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے۔" موجو نے کہا۔

"کیا یہ تینوں چیزیں مجھے بھی دیکھنے کی اجازت ہے۔" ایسے میں انسپکٹر جمشید بول اُٹھے۔

"ضرور - کیوں نہیں - آپ بھی دیکھ لیں - لیکن بھلا آپ ان کو دیکھ کر کیا کریں گے - یہ چیزیں تو صرف میرے دیکھنے کی تھیں - انھیں تو صرف میں پہچانتا ہوں۔" کنور لیاقت نے کہا۔

"ہاں! یہ ٹھیک ہے - لیکن اور خیال سے ان کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔"

"ضرور لیں - کوئی اعتراض نہیں۔" کنور لیاقت نے کندھے اچکائے۔

انھوں نے تینوں چیزوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھا، چند سیکنڈ تک بغور دیکھتے رہے، پھر کنور لیاقت کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے:

"کیا آپ کو یقین ہے - یہی وہ چیزیں ہیں جو پندرہ سولہ سال پہلے آپ کی بچّی پہنے ہوئے تھی۔"

"ہاں! بالکل یقین ہے۔"

"بچّی کی کوئی اور نشانی - آپ کے ذہن میں تو نہیں۔" انھوں نے کہا۔

"نشانی۔" کنور لیاقت نے اُلجھن کے عالم میں کہا۔

"ہاں! جسم پر کوئی پیدائشی نشان وغیرہ۔"

"جہاں تک مجھے یاد ہے - اس کے بائیں کان کے پیچھے ایک سیاہ نشان تھا - چاند کی شکل کا۔"

"آپ نے اس نشان کو ابھی تک نہیں دیکھا؟" انسپکٹر جمشید نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"ہوں - ٹھیک ہے۔"

یہ کہ کر وہ بچّی کی طرف بڑھے:

"ایک منٹ کنور صاحب۔" انسپکٹر جمشید بول اُٹھے۔

"جی فرمائیے۔" وہ چونک کر مڑا۔

"آپ نے بچّی کا نام کیا رکھا تھا؟"

"سونیا۔" اس نے فوراً کہا۔

"ہوں ٹھیک ہے - اب آپ کان والا نشان دیکھ لیں۔"

کنور لیاقت ایک ایک قدم اُٹھاتا بچّی کے پاس پہنچ گیا - بچّی معصومانہ انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی - انھوں نے اس کا کان موڑ کر دیکھا -

اچانک وہ چکر کھا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا -

ماجد منزل

"ارے! یہ — یہ انھیں کیا ہوا؟"

سب مہمان گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے — ملازم کنور لیاقت کی طرف لپکے — پھر اس کو اُٹھا کر ایک میز پر لٹا دیا گیا:

"حیرت ہے — انھیں کیا ہو گیا۔" کئی آوازیں اُبھریں۔

اسے ہوش میں لانے کی تدبیر شروع ہوئی — ایسے میں انسپکٹر جمشید نے قدم اٹھائے اور سونیا کے کان کو پلٹ کر دیکھا — وہاں سیاہ رنگ کا ایک چاند سا بنا ہوا تھا:

"بات سمجھ میں آ گئی — یہ اس سیاہ چاند کو دیکھ کر بے ہوش ہوئے ہیں۔" انھوں نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

"یہ کیا بات ہوئی — اسی نشان کو دیکھنے کے لیے تو وہ

آگے بڑھے تھے — اس کو دیکھ کر بے ہوش ہونے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔"

"ہو سکتا ہے — پہلی تین چیزوں کو دیکھ کر انھیں پوری طرح یقین نہ آیا ہو اور یہ نشان دیکھ کر مکمل طور پر یقین ہو گیا، بس خوشی برداشت نہ کر سکے اور بے ہوش ہو گئے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"لیکن بھلا ان چیزوں کو دیکھ کر انھیں کیوں یقین نہ آیا ہو گا۔" ایک مہمان نے اعتراض کیا۔

"اس لیے کہ یہ تین چیزیں تو کسی بھی بچی کے ساتھ پیش کی جا سکتی ہیں — فرض کیجیے — موجو بھائی میری اس بچی کو لے کر یہاں آئیں اور بتائیں کہ یہ تینوں چیزیں اس بچی کے جسم پر تھیں — تو کیا یہ ثبوت غلط نہیں ہو گا، لیکن خود بچّی کے جسم پر ایک نشان کا ہونا اور بات ہے — اور اس نشان کو دیکھ کر کنور صاحب کو مکمل طور پر یہ یقین آ گیا کہ بچّی ان کی ہی ہے۔"

چند منٹ کی کوشش کے بعد کنور لیاقت کو ہوش آ گیا:

"یہ — یہ تو بالکل میری بچّی ہے۔"

"بہت — تو کیا جناب پہلے آپ انھیں مکمل طور پر

اپنی بچی نہیں سمجھے تھے؟

"اس وقت۔ یعنی یہ نشان دیکھنے سے پہلے مَیں ایک حد تک شک میں مبتلا تھا۔"

"چلیے خیر۔ اب تو آپ کا شک دُور ہو گیا۔ مَیں دس لاکھ کا حق دار بن گیا۔" موجو نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں ضرور۔ کیوں نہیں۔" کنور لیاقت نے فوراً کہا۔

"اب چُوں کہ یہ تقریب ختم ہو چکی ہے۔ اس لیے ہم اجازت چاہیں گے۔" ایک مہمان نے کہا۔

"اوہ ہاں۔ ضرور۔ آپ سب کا بہت بہت شکریہ۔"

ایک ایک کر کے مہمان رخصت ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ سوائے چند مہمانوں کے سب رُخصت ہو گئے،

"کیا آپ لوگوں کا جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔" کنور لیاقت نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ اشارہ ان چاروں کی طرف تھا۔

"ابھی نہیں۔ ہمارے والا معاملہ تو رہ ہی گیا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"آپ دیکھ چکے ہیں کہ یہاں کوئی جرم نہیں ہوا۔ نہ کسی مجرم کے آثار یہاں نظر آئے۔ میری بیٹی والے معاملے میں بھی کوئی گڑ بڑ نہیں ہے۔ موجو بھائی نے

ہی میری بچّی کو اغوا کیا تھا اور اتنا عرصہ گزرنے کے بعد اس کے اندر نیکی نے سر ابھارا اور یہ اسے واپس کرنے پر تیار ہو گیا۔ رہی سہی کسر اس سیاہ نشان نے ختم کر دی۔ اس نشان کی موجودگی میں تو کسی قسم کے شک و شبے کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ کوٹھی کو اگر آپ اور اچھی طرح دیکھنا چاہتے ہیں تو مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔"

"ہاں! ہم پوری کوٹھی کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم چاہتے ہیں۔ رات کو یہاں ٹھہریں۔ ہو سکتا ہے۔ رات کو اس جرم کے باقی حصّے پر عمل کیا جائے۔"

"کیا مطلب۔ باقی حصّہ۔" کنور لیاقت اور دُوسرے چونک اُٹھے۔

"ہاں! مجھے یقین ہے۔ اس گھر میں کوئی جُرم ہو چکا ہے۔ لیکن جرم ابھی مکمل نہیں ہوا۔ اس لیے ہمیں یہاں کل تک ٹھہرنا ہو گا۔ اس وقت تک۔ جب تک کہ آپ بنک سے پیسے نکلوا کر موجو بھائی کو نہیں دے دیتے۔"

"خیر۔ مجھے تو اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ دعوت سے پہلے ضرور مجھے اعتراضات تھے۔ اور یہ اُلجھن بھی تھی کہ کہیں رنگ میں بھنگ نہ پڑ جائے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا،

سب کام ٹھیک ٹھاک ہوگیا ۔ اب میں مطمئن ہوں اور مجھے
آپ سے کوئی شکایت بھی نہیں ہے ۔ آپ شوق سے
یہاں ٹھہریں۔"

"شکریہ ۔ پروفیسر صاحب اور خان رحمان ۔ آپ دونوں اگر
جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔"

"نہیں بھئی ۔ ہم بھی نہیں جائیں گے۔" پروفیسر بولے۔

"معلوم ہوتا ہے ۔ آپ بھی یہ جاننے کے لیے بے چین
ہیں کہ جرم کیا ہوا ہے۔" محمود مسکرایا۔

"یہی کہ لو۔" انھوں نے شرما کر کہا۔

اور وہ مسکرا دیے ۔ انھیں دو کمرے دے دیے گئے۔
کمروں میں آتے ہی انسپکٹر جمشید بولے:

"میں فاروق کو ساتھ لے کر جا رہا ہوں ۔ تم یہاں
موجود رہو ۔ اور چوکس رہو۔"

"لیکن آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"سونیا کی گم شدگی کا ریکارڈ دیکھنے۔" انھوں نے کہا۔

باہر نکل کر وہ کار میں بیٹھے اور متعلقہ پولیس اسٹیشن
کی طرف روانہ ہوئے ۔ اگرچہ رات کا وقت تھا ۔ اور دفتر
بند ہو چکا تھا ، لیکن انھوں نے جلد ہی دفتر کھلوا لیا اور
سولہ سال پہلا ریکارڈ بھی نکلوا لیا ۔ اب اس ریکارڈ کی

الٹ پلٹ شروع ہوئی ۔

"کیا آپ صرف اس بات کی تصدیق کرنا چاہتے ہیں کہ
کنور لیاقت کی بیٹی کو اغوا کیا گیا تھا؟" فاروق نے پوچھا۔

"یہ بھی اور اس کے علاوہ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ
اس سلسلے میں کیا بھاگ دوڑ کی گئی تھی۔" وہ بولے۔

"ہوں ۔ ان تینوں چیزوں کے بارے میں ..."

فاروق کے الفاظ درمیان میں رہ گئے ۔ اسی وقت ایک
ہلکی سی آواز ابھری تھی ۔ دونوں نے چونک کر ایک دوسرے
کی طرف دیکھا ، پھر انسپکٹر جمشید جلدی سے اچھل کر کھڑے ہو
گئے ۔ فاروق نے بھی دیر نہ لگائی ، لیکن انھیں دیر ہو
چکی تھی ۔ ان کے کمرے میں چار نقاب پوش موجود
تھے ۔ اور ان چاروں کے ہاتھوں میں پستول تھے :

"ہم چاروں بہترین نشانہ باز ہیں ۔ اور جب چاروں
ایک ساتھ تم دونوں پر نشانہ لگائیں گے تو چار نہیں تو
دو گولیاں تو ضرور تمھیں لگ جائیں گی ۔ لہٰذا عقل مندی
اسی میں ہے کہ ہاتھ اوپر اٹھا دو۔" ان میں سے ایک نے
سرد آواز میں کہا۔

"کیا خیال ہے بھئی۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"چلیے ۔ یہ بھی کیا یاد کریں گے ۔ اٹھا دیتے ہیں ہاتھ۔"

فاروق بولا۔

دونوں کے ہاتھ اٹھ گئے۔

"ٹائیگر۔ یہ رجسٹر اور یہ فائل اٹھا لو۔ اور اپنا کام شروع کر دو۔ کمرے میں چاہے کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ تم اپنا کام جاری رکھو گے۔"

"او کے سر۔" ٹائیگر بولا۔

"کیا مطلب۔ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" انسپکٹر جمشید نے حیرت زدہ انداز میں کہا۔

"صرف اور صرف یہ کہ یہ فائل اور رجسٹر ہر حال میں جل جانا چاہیے۔" اس نے کہا۔

"پھر۔ اس کے جل جانے سے کیا ہو گا۔ حقیقت چھپ جائے گی۔" ان کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

"بالکل۔" وہ ہنسا۔

"تب پھر تم نے پہلے ہی کیوں نہ ان دونوں چیزوں کو جلا دیا تھا؟"

"یہ ہمارا کام نہیں۔ باس کا کام ہے۔" اس نے کہا۔

"اور تم کون ہو؟" فاروق نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میں۔ میں راشا ہوں۔ میرا نام سنا ہی ہو گا۔" اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"اب سے پہلے تو نہیں سنا تھا۔ اب سن لیا ہے۔ کیا کام کرتے ہو تم؟" انھوں نے منہ بنا کر کہا۔

"بس اسی قسم کے کام۔"

"اور یہ سب تم اس باس کے لیے کرتے ہو۔"

"ہاں بالکل۔ اور کیا آپ کے لیے کروں گا۔ آپ تو مجھے ایک دن کا خرچ بھی ادا نہیں کر سکتے۔ جب کہ باس میرا پورے تیس دن کا خرچ اٹھاتا ہے۔"

"اوہو۔ اتنا خرچ ہے تمھارا۔" فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"اتنے سے بھی دو ہاتھ آگے۔"

"خیر ہمیں کیا۔ ارے ارے۔ یہ کیا۔ تم تو سچ مچ رجسٹر اور فائل کو جلا رہے ہو۔" انسپکٹر جمشید گھبرا گئے۔

"تو کیا ہم مذاق کر رہے ہیں۔" راشا ہنسا۔

"کیوں بھئی فاروق۔ اب کیا کریں۔ یہ تو ہماری طرف ایک ساتھ چار پستول تانے کھڑے ہیں اور اب تو راشا کے ہاتھ میں دو پستول ہیں۔"

"اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ رجسٹر اور فائل یہ لوگ جلا نہ پائیں تو پھر مجھے حکم دیں۔ میں انھیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔"

"کیا پدّی اور کیا پدّی کا شوربا۔" راشا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"نہیں فاروق۔ جل جانے دو ان کو۔ یہ بھی کیا یاد کریں گے۔" وہ مسکرائے۔

"جی کیا فرمایا۔ جل جانے دیں۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ایسی معمولی چیزوں کے لیے ہم خطرہ کیوں مول لیں۔ میں ان کے بغیر بھی حقیقت کی تہ تک پہنچ سکتا ہوں۔" انھوں نے کہا۔

اس وقت تک راشا کا ایک ساتھی رجسٹر اور فائل پر پٹرول چھڑک چکا تھا۔ پٹرول کی بوتل اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے نکالی تھی۔

"گگ۔ کیا۔ تم لوگ پہلے ہی تیاری کر چکے تھے۔" فاروق کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"کس بات کی تیاری؟"

"رجسٹر اور فائل کو جلانے کی۔"

"ہاں بالکل۔ باس نے ہمیں پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ آپ لوگ ضرور ریکارڈ روم کا رخ کریں گے۔"

"حیرت ہے۔ اس کے اندازے تو حد درجے قابل

تعریف ہیں۔"

"ابھی تم لوگوں نے دیکھا ہی کیا ہے۔ جب ہمارے باس سے سامنا ہوگا تو پتا چلے گا۔ وہ صرف ہاتھ پیر کا ہی نہیں، عقل کا بھی دھنی ہے۔ عقل سے پہلے کام لیتا ہے اور ہاتھ پیر سے بعد میں۔ لیکن جب ہاتھ پیر چلاتا ہے تو اس وقت بھی عقل کا استعمال ترک نہیں کرتا۔"

"اور یہ ملاقات کب ہو رہی ہے۔" فاروق مسکرایا۔

"اس بارے میں بھلا میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ باس جانے۔" اس نے کندھے اچکائے۔

اسی وقت رجسٹر اور فائل کو آگ دکھا دی گئی۔ وہ ان کو جلتے ہوئے دیکھتے رہے۔ فاروق کے چہرے پر ایسے میں حیرت کے آثار تھے۔ اسے حیرت تھی اپنے والد پر۔ وہ اگر چاہتے تو ان چیزوں کو جلنے سے بچا سکتے تھے۔ ان لوگوں کے پستولوں کو وہ کس طرح خاطر میں لا سکتے تھے، لیکن انھوں نے ایسا کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

رجسٹر اور فائل جل کر راکھ ہوگئے۔ کمرے میں دھواں بھر گیا۔ ایسے میں راشا نے کہا:

"ہمارا کام یہاں ختم ہو گیا، اب ہم چلیں گے۔ آپ کا ہم سے لڑائی بھڑائی کا تو کوئی ارادہ نہیں؟"

"نہیں! تم سے لڑ کر کیا کریں گے۔ تمھارے باس سے لڑیں گے۔" فاروق بولا۔

"اچھا تو پھر دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جائیں۔ منہ بھی دیوار کی طرف کر لیں۔"

انھوں نے ایسا ہی کیا، پھر انھوں نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ وہ واپس پلٹے اور دروازے کی طرف بڑھے، لیکن وہ تو جاتے ہوئے دروازہ باہر سے بند کر گئے تھے۔

"آپ۔ آخر آپ نے انھیں کیوں جانے دیا۔ ہم رجسٹر اور فائل کو بھی بچا سکتے تھے اور ان کو بھی جانے نہ دیتے۔"

"بھئی ہاتھ پیر تھکائے بغیر اگر کوئی کام چل سکتا ہے تو کیوں ایسا کیا جائے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ہو سکتا ہے۔ آپ ان لوگوں تک کسی نہ کسی طرح پہنچ جائیں۔ لیکن فائل اور رجسٹر تو ضائع ہو ہی گئے۔"

"نہیں۔ یہ بھی ضائع نہیں ہوئے۔" انھوں نے کہا۔

"کیا مطلب؟" فاروق چونکا۔

"اس کا ایک ریکارڈ اور ہے۔ اب ہم وہاں جائیں گے۔" وہ بولے۔

"اور ان لوگوں کا کیا کرنا ہے؟"

"پہلے ریکارڈ۔ ان لوگوں سے بعد میں بات کریں گے۔" وہ بولے۔

انھوں نے بند کمرے میں سے اکرام کو فون کیا۔ آخر وہ وہاں پہنچا۔ دفتر کے دو آدمی جنھوں نے ان کے لیے دفتر کھولا تھا اور ریکارڈ نکال کر دیا تھا۔ باہر بے ہوش پڑے تھے۔ ان کے سر خون آلود تھے۔

"یہ کیا چکر ہے سر؟" اکرام کے لہجے میں حیرت تھی۔

انھوں نے اسے چکر کے بارے میں بتایا، پھر اسے ساتھ لے کر ایک دوسرے دفتر پہنچے۔ ریکارڈ نکلوایا گیا۔ رجسٹر میں سونیا کی گم شدگی کی رپورٹ جلد ہی مل گئی۔ اسے واقعی سولہ سال پہلے اغوا کر لیا گیا تھا۔ فائل کے مطالعے سے انھیں پتا چلا، کیس کی تفتیش سوکھے رام نے کی تھی۔

"سوکھے رام۔ ہندو پولیس انسپکٹر۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"اور پندرہ سال پہلے ریٹائر ہو چکا ہے۔ اب کہاں ملے گا ہمیں؟" اکرام بڑبڑایا۔

"پہلے ہم یہ تو دیکھ لیں۔ کہ اس نے تفتیش کیا کی تھی۔"

وہ فائل کا جائزہ لیتے رہے۔ اس میں سوکھے رام کی بھاگ دوڑ کا ذکر تھا، لیکن وہ سونیا کو کہیں تلاش نہیں کر سکا تھا۔ اگرچہ کنور لیاقت نے ایک لاکھ روپے کے انعام کا بھی اعلان کر رکھا تھا۔

"آخر اس ریکارڈ کو جلانے کی ان لوگوں کو کیا ضرورت تھی۔ اس سے تو ہم کچھ بھی معلوم نہیں کر سکے۔" فاروق نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔

"کوئی بات تو ضرور ہو گی۔" اکرام بولا۔

"اور کیا۔ اس شخص کو یہ معلوم نہیں کہ ہمارے پاس دوہرا ریکارڈ ہوتا ہے۔"

"دوہرے ریکارڈ والی بات ہر کوئی نہیں جانتا۔ یہاں تک کہ عام پولیس والوں کو بھی نہیں معلوم۔ ہاں اعلیٰ آفیسرز کو ضرور یہ بات معلوم ہے۔"

"اوہ۔ اس کا مطلب ہے۔ وہ لوگ اسی لیے رجسٹر اور فائل جلا کر مطمئن ہو گئے ہوں گے۔" فاروق نے کہا۔

"بالکل۔ اب کیا پروگرام ہے سر؟"

"ہمارے سامنے دو کام ہیں۔ سوکھے رام کی تلاش اور ان لوگوں تک پہنچنا۔ جنھوں نے ریکارڈ کو جلایا ہے۔ پہلے ذرا ہم سوکھے رام کے گھر تک چلتے ہیں۔ ذرا دیکھیں تو

سہی۔ کیا یہ شخص اب بھی وہیں رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے، اس سے کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔"

"ہوں ٹھیک ہے۔" فاروق اور اکرام بولے۔

وہ سوکھے رام کے پتے پر پہنچے۔ ایک چھوٹے سے مکان کے دروازے پر بڑا سا پرانا تالا لٹک رہا تھا۔

"یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے وہ اس جگہ کی رہائش کافی عرصہ پہلے چھوڑ چکا ہے۔"

"تالے سے یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔"

انسپکٹر جمشید نے ساتھ والے مکان کے دروازے پر دستک دی، ایک ادھیڑ عمر آدمی باہر نکلا اور انھیں پریشان نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا:

"جی فرمایئے۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی کپکپی تھی۔

"یہ مسٹر سوکھے رام کہاں گئے؟"

"انسپکٹر سوکھے رام کہیے۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"ہاں! انسپکٹر سوکھے رام ہی۔" وہ بولے۔

"عرصہ ہوا یہاں سے چلے گئے بے چارے تنگ آ کر۔" اس نے سرد آہ بھری۔

"تنگ آ کر۔ کیا مطلب؟"

"جب بھی کوئی انھیں سوکھے رام کہتا۔ تو وہ چلّا کر

کہتا۔ مجھے انسپکٹر سوکھے رام کہو۔ خالی سوکھے رام نہیں۔
دراصل جب سے وہ ریٹائر ہوئے تھے۔ لوگوں نے انھیں
انسپکٹر کہنا چھوڑ دیا تھا۔ اس بات نے انھیں چڑچڑا کر
دیا۔ وہ ہر وقت دوسروں پر بگڑتے رہتے۔ لوگوں نے
انھیں چڑانا شروع کر دیا۔ اس طرح وہ تماشا بن کر رہ
گئے۔ ایک رات وہ خاموشی سے اس گھر سے نکل گئے۔"

"ان کے گھر کے کُل کتنے افراد تھے؟"

"دو میاں بیوی۔ ایک بیٹی۔ اور بس۔ اس روز سے یہ
مکان بند پڑا ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ سوکھے رام
کہاں گئے۔ اگر وہ کسی کو بتا کر جاتے تو ان کی چڑ اس جگہ
بھی پہنچ جاتی۔"

"ہوں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم انھیں تلاش
نہیں کر سکتے۔"

"آپ کو ان سے کیا کام آ پڑا جناب؟" اس نے حیران
ہو کر کہا۔

"ہماری کچھ نہ پوچھیے جناب۔ ہمیں تو ایسے ایسے لوگوں
سے کام پڑ جاتا ہے کہ جن کا لوگ نام تک بھول چکے
ہوتے ہیں۔" فاروق مسکرایا۔

"جی۔ میں سمجھا نہیں۔" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"اس میں آپ کا قصور نہیں۔ ان کی بات ذرا مشکل
سے سمجھ میں آتی ہے۔" اکرام مسکرایا۔

"اچھا جناب۔ بہت بہت شکریہ۔ ہم نے آپ کو زحمت
دی۔ ویسے آپ کا نام کیا ہے؟" انسپکٹر جمشید نے اس کی
طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں مختار کریمی ہوں۔" اس نے کہا۔

وہ وہاں سے چل پڑے۔

"اکرام تم راشا کو جانتے ہو؟"

"راشا۔ جی ہاں۔ وہ ایک غنڈا ٹائپ آدمی ہے۔ پولیس
والوں کو اپنا دوست بنا کر رکھتا ہے۔ اور انھیں کھلاتا
پلاتا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ جب بھی اسے پکڑنے کا پروگرام
بنایا جاتا ہے۔ کوئی نہ کوئی مخبری کر دیتا ہے اور وہ
غائب ہو جاتا ہے۔"

"ہوں! فائل اور رجسٹر اسی نے آ کر اپنے ساتھیوں سے
جلوائے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اوہ۔ یہ بات آپ نے چکر کی تفصیل سناتے وقت
نہیں بتائی تھی۔" اکرام چونکا۔

"تو پھر۔ تم اس کے کسی ٹھکانے سے واقف ہو؟"

"ایک دو جگہیں میرے ذہن میں ہیں تو سہی۔" اکرام بڑبڑایا۔

"ٹھیک ہے۔ ان جگہوں کو چیک کر لیتے ہیں۔"

ان کی کار ایک چھوٹے سے ہوٹل کے سامنے رکی۔ کار سے اتر کر وہ اندر پہنچے۔ فوراً ہی چھوٹے سے قد کا ایک آدمی آگے بڑھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا:

"میری ایسی قسمت کہاں کہ آپ میرے ہوٹل میں تشریف لائیں۔ آئیے۔ اسی طرف آئیے۔"

"کسی طرف جانے کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ بتا دو کہ راشا کہاں ہے؟"

اس کا رنگ اڑ گیا۔ آنکھوں میں خوف دوڑ گیا:

"تو آپ مجھ سے راشا کے بارے میں پوچھنے آئے ہیں۔" وہ کانپتی آواز میں بولا۔

"اور اس کا مطلب ہے۔ ہم ٹھیک جگہ پر پہنچے ہیں۔"

"ہاں! لیکن میرے لیے پریشانی لے کر آئے ہیں۔ وہ میرا دشمن بن جائے گا۔"

"ہو سکتا ہے۔ یہی بات ہو۔ لیکن ہم اسے اس قابل رہنے ہی کب دیں گے کہ وہ تمہارا کچھ بگاڑ سکے۔"

"ایسا نہ کہیے۔ آج کل وہ بہت اونچی ہواؤں میں ہے، ایسا لگتا ہے جیسے۔ اسے قارون کا خزانہ مل گیا ہے۔ یا ملنے والا ہے۔ دھڑا دھڑ ادھار لے رہا ہے۔"

"کیا کہا۔ دھڑا دھڑ ادھار لے رہا ہے۔ جن لوگوں کو قارون کا خزانہ مل جائے، وہ بھی بھلا ادھار لیتے ہیں۔"

فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"لیکن جن لوگوں کو یہ خیال ہو کہ وہ جلد ہی کوئی بڑا ہاتھ مارنے والے ہیں۔ وہ ضرور دھڑا دھڑ ادھار لے سکتے ہیں۔"

"اور اسے دھڑا دھڑ ادھار لینے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت۔ جوا کھیلنے سے زیادہ ضرورت اور کیا ہو سکتی ہے۔"

"اوہ۔ تو یہ بات ہے۔ خیر۔ مسٹر شاہی۔ تم بے دھڑک اس کا پتا بتا دو۔ وہ تم تک نہیں پہنچ سکے گا۔" اکرام بولا۔

"دیکھ لیجیے انسپکٹر صاحب۔ کہیں میں بے موت نہ مارا جاؤں، وہ بہت خونخوار آدمی ہے۔ بات بات پر چاقو نکال لیتا ہے۔ اور یہ بات تو اسے آگ کی طرح سرخ کر دے گی۔ میرے علاوہ اس کا پتا کسی کو نہیں معلوم۔ اور اسے مجھ پر بہت اعتماد ہے۔ دوسرے وہ یہ بات بھی جانتا ہے کہ میں اس سے بہت ڈرتا ہوں۔ لہٰذا اس کا پتا کسی کو نہیں بتاؤں گا۔"

"اور اسے اپنا پتا تمہیں بتانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"وہ اپنے لیے پیغامات میرے ذریعے ہی وصول کرتا ہے
اور جس کسی کو کوئی پیغام دینا ہوتا ہے۔ میرے ذریعے
دیتا ہے۔ ان حالات میں اسے مجبوراً مجھے پتا بتانا پڑا۔ ویسے
اب وہ میرے ہوٹل میں نہیں بیٹھتا۔ پہلے کبھی بیٹھا کرتا تھا۔"

"خیر۔ تم پتا بتاؤ۔" اکرام نے منہ بنایا۔

"ایک بار پھر میں کہوں گا۔ ہاتھ ڈالنا ہے تو مضبوط
ڈالیے گا۔ اگر وہ آپ کے ہاتھ نہ آیا تو مجھ تک ضرور پہنچ
جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ تم فکر نہ کرو۔"

"تو پھر وہ جیدی کے جوئے خانے میں ملے گا۔"

"لیکن ہم نہیں جانتے۔ جیدی کا جوا خانہ کہاں ہے اور
جیدی کون ہے؟"

"جیدی ایک غیر معروف سا آدمی ہے۔ ہمیشہ پولیس سے
بچ کر کام کرتا ہے۔ اس کا یہ جوا خانہ بھی خفیہ ہے۔
اور پولیس کی نظروں سے بالکل محفوظ ہے۔"

"تب پھر ہم کس طرح پہنچیں گے؟"

"مجھے بھی اس جگہ کا پتا راشا کے ذریعے ہوا۔ ورنہ
میں بھی نہیں جانتا تھا۔ اور میرے بارے میں تو آپ کو
پتا ہی ہے۔ کسی زمانے میں ضرور چرس کا کاروبار کرتا

تھا۔ اب تو صرف اس ہوٹل کی آمدنی پر گزارا کرتا ہوں۔
سارے غلط دھندے چھوڑ دیے ہیں میں نے۔" اس نے جلدی
جلدی کہا۔

"ہاں! جانتا ہوں۔ تم جوئے خانے کا پتا بتاؤ۔" اکرام
نے منہ بنایا۔

"آپ کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے آپ کو
میری بات پر یقین نہیں آیا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ یقین آگیا ہے۔ تم پتا بتاؤ۔"

"ماجد منزل۔ یہ عمارت کا نام ہے۔ سرور روڈ پر
واقع ہے۔ عمارت جیدی نے کرائے پر لے رکھی ہے۔
بظاہر اس عمارت میں کمیشن ایجنٹ قسم کے لوگ بیٹھتے ہیں،
لیکن اس کے نچلے حصے میں دن رات جوا ہوتا ہے۔"

"اوہ!" ان کے منہ کھل گئے۔

دس لاکھ کی بیٹی

"آپ دونوں سو جائیں انکل۔ ہمیں رات جاگ کر گزارنا ہو گی۔" محمود نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرتے ہوئے دبی آواز میں کہا۔

"گویا تم موجو بھائی کی نگرانی کرو گے۔" خان رحمان بولے۔

"جی ہاں! اسی لیے تو ابا جان ہمیں یہاں چھوڑ گئے ہیں۔"

"تب پھر۔ میں بھی تم لوگوں کے ساتھ جاگوں گا۔ ہاں۔ پروفیسر صاحب ضرور آرام کر سکتے ہیں۔"

"کیوں مجھے کیا ہے۔ میں کیوں آرام کر سکتا ہوں۔" پروفیسر داؤد نے خان رحمان کو گھورا۔

"ہائیں انکل۔ آپ اور ہمارے ساتھ رات کو جاگیں گے۔"

"ہاں بھئی۔ میں تو اس معاملے میں بہت دلچسپی محسوس کر رہا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے۔ آپ میں بھی جاسوسی کے جراثیم حلول کر گئے ہیں۔" فرزانہ چہکی۔

"نہیں بھئی۔ جراثیم حلول نہیں کیا کرتے۔ وہ تو رُوحیں حلول کرتی ہیں۔" پروفیسر مسکرائے۔

"ویسے فرزانہ۔ تمھارا اس سونیا کے بارے میں کیا خیال ہے؟" محمود بولا۔

"سونیا کی بجائے تم موجو بھائی کے بارے میں کیوں نہیں پوچھتے۔"

"چلو۔ اس کے بارے میں اپنا خیال ظاہر کر دو۔"

"سونیا کو اس نے اغوا کیا تھا۔ ہو سکتا ہے، اس وقت اس نے انتقام لینے کے لیے ایسا کیا ہو، لیکن بعد میں اس نے سوچا کہ کیوں نہ اس لڑکی کے ذریعے لاکھوں روپے حاصل کر لیے جائیں۔ وہ بھی قانونی انداز میں۔" فرزانہ نے جلدی جلدی کہا۔

"خیر۔ یہ بات تو سمجھ میں آ گئی، لیکن ان حالات میں یہاں جرم کون سا ہوا ہے۔ ہم کالے چور کے دونوں خط کس طرح بھول جائیں۔"

"ہاں واقعی۔ جرم کا سراغ لگانے کے لیے ہی تو ہم یہاں نظر آ رہے ہیں اور ابا جان اور فاروق نہ جانے

کہاں مصروف ہوں گے۔"

"ریکارڈ روم میں۔"

"ریکارڈ روم سے تو وہ کب کے فارغ ہو چکے ہوں گے۔"

عین اسی وقت انھوں نے کسی کے زور زور سے سسکنے کی آوازیں سنیں۔ ان کے کان کھڑے ہو گئے:

"یہ۔ یہ آواز کیسی ہے؟" پروفیسر داؤد نے گھبرا کر کہا۔

"فکر نہ کریں انکل۔ اس کوٹھی پر کسی آسیب کا سایہ ہرگز نہیں ہے۔" محمود مسکرایا۔

"مم۔ میرا بھی یہ مطلب نہیں تھا۔ آؤ دیکھیں۔"

وہ کمرے سے نکل آئے۔ موجو بھائی کے کمرے کا دروازہ کھلا نظر آیا اور دروازے میں کنور لیاقت بے چارگی کے عالم میں کھڑے تھے۔ سسکیوں کی آواز اسی کمرے سے آ رہی تھی، یہ اور آگے بڑھے۔ کمرے میں موجو بھائی فرش پر اکڑوں بیٹھا تھا اور اس کے سامنے سونیا ہاتھ جوڑے بیٹھی تھی۔

"خیریت تو ہے کنور صاحب؟" خان رحمان نے حیران ہو کر کہا۔

"سونیا۔ میری بچی۔ رو رہی ہے۔ یہ مجھے اپنا باپ

ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اس کا کہنا ہے۔ موجو بھائی ہی اس کا باپ ہے۔ اور یہ اسے دس لاکھ کے بدلے میں بیچ رہا ہے۔ دراصل یہ اس کے پاس پلی ہے نا۔ موجو بھائی نے اسے یہ راز کبھی نہیں بتایا تھا۔ آج اس کی انسانیت جاگ گئی تو یہ میری بیٹی مجھے لوٹانے پر مجبور ہو گیا، لیکن سونیا کو اب کون سمجھائے۔ موجو بھائی تو سمجھا سمجھا کر تھک چکا ہے۔"

"ہوں۔ صورتِ حال واقعی تکلیف دہ ہے۔ اگر ان کی والدہ زندہ ہوتیں تو ان کی ممتا انھیں سب کچھ سمجھا دیتی۔ خیر آپ انھیں اپنے کمرے میں لے جائیں۔ انھیں ان کے بچپن کی باتیں سنائیں۔ اس طرح ایک تو ان کا دل بہل جائے گا، دوسرا انھیں یقین بھی آ جائے گا کہ یہ آپ کی ہی بیٹی ہیں۔"

"ہوں ٹھیک ہے۔ آؤ بیٹی چلیں۔"

"نہیں نہیں۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ میں ان کے ساتھ رہوں گی۔ یہی میرے بابا ہیں۔"

"تم چلو تو سہی۔ آؤ۔" یہ کہتے ہوئے کنور لیاقت اندر داخل ہو گئے اور سونیا کو بازو سے پکڑ کر اٹھا لیا، پھر اسے کھینچ کر لے گئے۔ موجو بھائی نے سر اوپر اٹھایا تو اس کی

آنکھوں میں آنسو تھے۔

"اُف - یہ میں نے اپنے آپ کو کس مصیبت میں پھنسا لیا۔"

"تو دس لاکھ کا لالچ نہ کرتے نا۔" فرزانہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں - اصل میں تو مجھے گناہ کے احساس نے ستا رکھا تھا - میں نے سوچا - یہ جرم یہ گناہ تو مجھے جیتے جی چین کا سانس نہیں لینے دے گا - لہٰذا میں نے سونیا کی واپسی کا ارادہ کر لیا - انعام کی بات تو وقتی طور پر ذہن میں آئی تھی - اور پھر میں نے اسے سولہ سال تک پالا پوسا ہے - اس کو تعلیم دلائی ہے - کھلایا پلایا ہے - اس کا کچھ تو معاوضہ مجھے ملنا چاہیے، تاکہ میری باقی زندگی آرام اور چین سے گزر جائے۔"

"ہوں - آپ جانیں - آپ کا کام - ویسے کیا سونیا واقعی کنور صاحب کی بیٹی ہیں؟"

"ارے - تو کیا آپ کو اب تک اعتبار نہیں آیا اس بات پر۔" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"دراصل - ہم لوگ اعتبار کرنے کے معاملے میں ذرا کنجوس واقع ہوئے ہیں۔" فرزانہ مسکرائی۔

"پتا نہیں - آپ کیا کر رہے ہیں، میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں - مجھے اور پریشان نہ کریں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور دروازہ بند کر لیا -

تمام رات انھوں نے جاگ کر گزار دی، لیکن کوٹھی میں کوئی عجیب و غریب بات یا واقعہ نہ ہوا - اور اس وقت انھیں معلوم ہوا - ان کے والد اور فاروق ابھی تک لوٹ کر نہیں آئے تھے - یہاں تک کر انھیں ناشتے کے لیے بلایا گیا -

ناشتے کی میز پر انھوں نے سونیا کو دیکھا - اس کی سُرخ سُرخ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ تمام رات روتی رہی ہیں - ناشتے کے بعد کنور لیاقت نے ایک چیک موجو بھائی کی طرف بڑھا دیا -

"یہ دس لاکھ روپے بنک سے لے لیں - یا وہاں اپنا اکاؤنٹ کھلوا کر وہیں جمع کرا لیں۔"

"ایسے نہیں - اپنا کوئی آدمی میرے ساتھ بھیجیے - میں بھی اکاؤنٹ کھلوانا پسند کروں گا۔" موجو بھائی نے کہا۔

"اچھی بات ہے۔"

جوں ہی موجو بھائی رخصت ہونے لگے - سونیا دوڑ کر اس سے لپٹ گئی اور پھر رونے لگی - انھیں بڑی مشکل

سے الگ الگ کیا گیا۔ موجو بھائی کے جانے کے بعد کنور لیاقت
نے فرزانہ اور محمود کی طرف دیکھا :

"میرے گھر میں کوئی جرم نہیں ہوا۔ وہ خطوط ضرور کسی
کا مذاق تھا۔ اس لیے اب آپ لوگ بھی تشریف لے جانا
پسند کریں گے یا ابھی اور سراغ لگائیں گے"۔ اس کے لہجے
میں گہرا طنز تھا۔

"جی نہیں۔ اب ہم یہاں رُک کر کیا کریں گے۔ آپ کو
آپ کی دس لاکھ کی بیٹی مبارک ہو"۔ محمود نے پُر سکون آواز
میں کہا۔

"کیا کہا۔ دس لاکھ کی بیٹی"۔ کنور لیاقت چونکا۔

"جی ہاں! کیا آپ نے انھیں دس لاکھ دے کر حاصل
نہیں کیا"۔ فرزانہ مسکرائی۔

"ہاں۔ ٹھیک ہے، لیکن حقیقت میں بھی تو یہ میری
ہی بیٹی ہے"۔

"ہم نے یہ تو کہا ہی نہیں کہ یہ آپ کی بیٹی ہیں
یا نہیں"۔ محمود نے کہا اور پھر وہ پروفیسر داؤد اور خان رحمان
کی طرف مڑا :

"کیا آپ ہمارے ساتھ چلنا پسند فرمائیں گے؟"

"تو اور کس کے ساتھ جانا پسند کریں گے، لیکن حیرت

کی بات تو یہ ہے کہ جمشید اور فاروق کہاں رہ گئے"۔ پروفیسر
بولے۔

"کہیں اُلجھ گئے ہوں گے۔ آ جائیں گے"۔ محمود بے فکری
کے عالم میں بولا۔

کنور لیاقت سے رُخصت ہو کر وہ باہر آئے :

"یہ تو کچھ بھی نہیں ہوا بھئی۔ یہاں تو واقعی کوئی جرم
نہیں ہوا"۔ خان رحمان بڑبڑائے۔

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ابا جان اور فاروق کی
واپسی پر ضرور کچھ اندازہ لگ سکے گا"۔

"ارے۔ م۔ مگر"۔ فرزانہ زور سے اُچھلی۔ اس کی
آنکھوں میں گھبراہٹ دوڑ گئی۔

"کیا ہوا؟"

"کیا موجو بھائی نے اپنی رہائش کا پتا کنور صاحب کو
بتایا ہے۔ ایسا نہ ہو، وہ رقم لے کر غائب ہو جائے اور
ابا جان ہم سے اس کا پتا پوچھیں"۔

"ارے باپ رے۔ یہ تو بڑی بھاری غلطی ہونے لگی
تھی۔ ہو سکتا ہے، اس نے بالکل غلط پتا بتایا ہو"۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ ابھی تیر کمان سے نہیں نکلا"۔
وہ واپس مڑے۔ گھنٹی کا بٹن دبایا۔ کنور لیاقت خود

ہی پلٹ آئے:

"خیریت۔ اب کیا ہوا؟"

"کیا مسٹر موجو بھائی نے آپ کو اپنا پتا بتایا ہے؟"

"پپ۔ پتا۔ نہیں تو۔" اس کے منہ سے نکلا۔

"آپ کا بنک کون سا ہے؟"

"نیشنل بنک۔ راجا ٹاؤن برانچ۔"

"شکریہ۔ ہم وہیں پہنچ کر اس سے پتا معلوم کر لیتے ہیں۔"

"ضرور۔ کیوں نہیں۔" اس نے کہا۔

اور وہ راجا ٹاؤن کی طرف مڑ گئے۔ بنک میں موجو بھائی کنور لیاقت کے ملازم کے ساتھ موجود تھا۔ انھیں دیکھ کر وہ چونکا:

"آپ لوگ یہاں بھی آ گئے۔" اس نے بُرا سا منہ بنایا۔

"ہاں! کیا کریں۔ آنا ہی پڑا۔"

"لیکن کیوں۔ کیا میں یہاں بھی کوئی جرم کروں گا؟"

"یہ بات نہیں۔" فرزانہ بولی۔

"تو پھر۔ جو بات ہے۔ آپ وہ بتائیں نا۔"

"آپ نے اپنا پتا کنور صاحب کو نہیں بتایا۔ مہربانی فرما

کر پتا لکھوا دیں۔"

"ضرور۔ کیوں نہیں۔ لکھ لیں۔ مجاہد آباد، گلی نمبر ۱۱، مکان نمبر ۱۰۔"

"بہت بہت شکریہ۔ آپ اکاؤنٹ کھلوا رہے ہیں یا نقد رقم وصول کریں گے؟"

"یہ جگہ میرے۔ گھر سے بہت دور ہے۔ میں نے سوچا ہے۔ مجاہد آباد کی شاخ میں اکاؤنٹ کھلواؤں گا۔" موجو بھائی نے کہا۔

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔"

وہ بنک سے نکل آئے۔

"محمود۔ تم اسی وقت مجاہد آباد کی طرف روانہ ہو جاؤ، اور معلوم کرو کہ موجو بھائی واقعی وہاں رہتا ہے۔ میں یہاں رہ کر اس کی نگرانی کروں گی اور پھر اس کا تعاقب کروں گی۔ انکلز۔ آپ لوگ چلیں۔"

"اگرچہ جانے کو جی نہیں چاہ رہا، لیکن شاید اب ہم تمہارے کام میں رکاوٹ بنیں گے۔" پروفیسر داؤد مسکرائے۔

"جج۔ جی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔" فرزانہ جلدی سے بولی۔

"خیر- خیر- جب اس معاملے کے بارے میں کوئی خاص بات معلوم ہو- ہمیں ضرور فون کر دینا۔"

"جی بہتر!" فرزانہ بولی۔

دونوں اپنے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ محمود مجاہد آباد کی طرف چلا گیا اور فرزانہ بنک کے سامنے کھڑی رہ گئی۔ کافی دیر بعد موجو بھائی اور کنور لیاقت کا ملازم باہر نکلتے نظر آئے۔ موجو بھائی کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا۔ گویا دس لاکھ روپے اس بیگ میں تھے۔ اب موجو بھائی نے ایک ٹیکسی روکی۔ فرزانہ پہلے ہی ایک ٹیکسی روک چکی تھی۔ کنور لیاقت کا ملازم موجو بھائی کی ٹیکسی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر آگے بڑھ گیا۔ ادھر فرزانہ کی ٹیکسی موجو بھائی کا تعاقب کر رہی تھی۔ آخر وہ مجاہد آباد پہنچ گئے۔ پھر فرزانہ نے موجو بھائی کو ٹیکسی سے اتر کر ایک گلی میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ بھی اتر آئی۔

"تو تم بھی یہاں پہنچ گئیں۔" اس نے محمود کی آواز سنی۔

"اگر موجو بھائی یہاں نہ آتا تو میں بھی کیوں آتی۔ کیا خبر ہے؟"

"موجو بھائی تیرہ چودہ سال سے اس مکان میں رہ رہا ہے۔ تیرہ سال پہلے یہ ایک بچی کے ساتھ اس مکان میں آکر رہائش پذیر ہوا تھا۔"

"کیا یہ مکان کرائے کا ہے؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"ہاں!" محمود بولا۔

"گویا ابھی تک ہم کسی مجرم کی بھنک تک محسوس نہیں کر سکے۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"ہے تو بات یہی، لیکن اس میں ہمارا کیا قصور۔"

"اور کالے چور کا کہنا ہے کہ کوئی نہ کوئی جرم ہو کر رہے گا۔"

"سوال یہ ہے کہ اب ہم کیا کریں؟"

"یہاں ایک سادہ لباس والے کو مقرر کر کے ہم گھر چلتے ہیں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ابا جان اور فاروق آخر کہاں ہیں۔"

"ہوں! ٹھیک ہے۔"

انھوں نے دفتر فون کیا۔ اکرام وہاں موجود نہیں تھا، اس کے بارے میں کسی کو معلوم بھی نہیں تھا، آخر انھوں نے محمد حسین آزاد سے کہ کر ایک سادہ لباس والے کو بلایا۔ اسے ہدایات دیں اور گھر پہنچے۔ انسپکٹر جمشید

اور فاروق گھر نہیں آئے تھے۔ اب تو وہ پریشان ہو گئے۔

عین اسی وقت فون کی گھنٹی بجی، محمود نے جلدی سے ریسیور اٹھایا اور پھر دوسری طرف کی آواز سن کر چونک اٹھا۔ ادھر سے سونیا بول رہی تھی۔۔۔

کیس کا ناشتا

شاہی کے ہوٹل سے نکل کر انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا:

"شاید آپ سیدھے ماجد منزل جانا چاہتے ہیں۔" فاروق مسکرایا۔

"ہاں بھئی۔ اب نکل جو آئے ہیں۔ تو پھر تفتیش مکمل کر کے ہی گھر جائیں گے۔" انھوں نے جواب دیا۔

"گھر یا کنور لیاقت کے ہاں۔"

"اگر وہاں جانے کی ضرورت ہوئی تو وہاں چلے جائیں گے۔ اب آؤ۔"

"لیکن۔ مسٹر شاہی ہمیں عمارت کے اندر داخل ہونے کا طریقہ نہیں بتا سکے۔ اور انھیں معلوم بھی نہیں ہے، پھر ہم۔ ہم کس طرح داخل ہوں گے۔"

"ریڈی میڈ میک اپ کر کے۔ اور جواریوں والا حلیہ بنا کر۔"

انسپکٹر جمشید نے کہا۔

گاڑی میں بیٹھ کر انھوں نے حلیے تبدیل کیے۔ اور ماجد منزل کے سامنے پہنچ گئے۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی انھوں نے جائزہ لینا شروع کر دیا۔ پندرہ منٹ کے جائزے کے بعد انسپکٹر جمشید بولے:

"اس وقت تک اکیس آدمی ایسے عمارت میں داخل ہو چکے ہیں جن کے بائیں ہاتھ میں نیلے رنگ کے مصنوعی پھول تھے۔ اتنے بہت سے آدمی نیلے رنگ کے پھول لے کر آخر اندر کیوں داخل ہوئے۔ کیا وہ سب کے سب جواری تھے۔ اور نیلے پھول انھوں نے نشانی کے طور پر پکڑ رکھے تھے۔ اگر یہی بات ہے تو پھر پہلے ہمیں نیلے پھول حاصل کرنا ہوں گے۔ اور اس کے لیے ہمیں بازار جانا پڑے گا، لیکن بھئی۔ بازار تو اب بند ہو چکا ہے۔"

"تب پھر۔ آنے والے دو چار آدمیوں کے نیلے پھولوں پر ہاتھ صاف کر دیں۔" فاروق نے تجویز پیش کیا۔

"ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔ آؤ۔ کچھ اور پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔"

انھوں نے اپنی گاڑی پیچھے ہٹانا شروع کی۔ اچانک فاروق زور سے چونکا:

"ابّا جان۔ اس طرف دیکھیے۔"

انھوں نے ادھر دیکھا۔ فٹ پاتھ پر ایک غریب سا آدمی پلاسٹک کی چٹائی بچھائے اس پر مختلف چیزیں سجائے بیٹھا تھا۔

"اس میں کیا خاص بات ہے۔ غریب آدمی ہے بے چارہ۔" اکرام بڑبڑایا۔

"لیکن انکل۔ اتنی رات گئے۔ اب اس سے کون کچھ خریدے گا۔"

"لیکن نیلے پھول ضرور خریدے جا سکتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"اوہ!" اکرام دھک سے رہ گیا۔

پلاسٹک کی چادر پر جہاں بچوں کی بے شمار چیزیں بھی تھیں، وہاں ایک طرف نیلے پھول بھی موجود تھے۔ اب تو ان پر جوش طاری ہو گیا۔ وہ گاڑی سے اُتر کر اس کی طرف بڑھے۔ فاروق نے تین نیلے پھول اُٹھا لیے اور بولا:

"یہ تین۔ نیلے پھول کتنے کے ہیں بابا؟"

"م۔ بابا!" اس کے مُنہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا۔

"کیوں۔ کیا ہوا۔ کیا آج تک تمھیں کسی نے بابا کہ کر نہیں پکارا۔" فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"نن۔ نہیں۔ بہرحال۔ آج کا نمبر ۱۲ ہے۔" اس نے کہا۔
انسپکٹر جمشید نے فوراً فاروق کا ہاتھ دبا دیا۔

"ٹھیک ہے۔" انھوں نے کہا اور جانے کے لیے مُڑ گئے۔
بوڑھے آدمی نے کوئی اعتراض نہ کیا۔

"ہمیں صرف نیلے پھول اٹھا لینے چاہییں تھے۔ اس سے کوئی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اب شاید وہ شک میں پڑ چکا ہے۔ خیر پروا نہیں۔"

"اور یہ بارہ نمبر کیا ہے؟"

"اندر چل کر معلوم ہو جائے گا۔ ویسے یہ تو بہت ہی آسان طریقہ کار ہے۔ اس طرح تو کوئی بھی اندر داخل ہو سکتا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"آسان کیسے ابّا جان۔ یہ تو آپ تھے جنھوں نے نیلے پھول والے معاملے کو بھانپ لیا۔ جہاں تک میرا خیال ہے۔ ضرور اِدھر اُدھر جیدی کے ایجنٹ پھر رہے ہوں گے۔ وہ جوا کھیلنے والوں کو پہچانتے ہوں گے اور طریقہ کار بتا کر اس بوڑھے کے پاس بھیجتے ہوں گے۔"

انھوں نے اپنی کار دُوسری کاروں کے ساتھ پارک کی اور عمارت میں داخل ہو گئے۔ فوراً ہی ان کی طرف ایک لمبے قد والا لپکا:

"نمبر پلیز۔"

"بارہ۔"

"شکریہ۔ اس طرف چلے جائیں۔" اس نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ اس دروازے میں داخل ہوئے۔ اب وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں تھے۔ وہاں ایک کرسی پر موٹے جسم کا اور کالے رنگ کا آدمی بیٹھا تھا۔

"تین سَو روپے۔" اس نے کہا۔

انسپکٹر جمشید نے جیب سے تین سَو روپے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔

"جب سُرخ بلب جلے۔ فوراً اُٹھ کر کھڑے ہو جائیے گا۔ اور اس کمرے میں جو راستا نمودار ہو۔ اس میں داخل ہو جائیے گا۔" اس نے جلدی جلدی کہا۔

"بہت بہتر۔"

اسی وقت سُرخ بلب جلا۔ وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے، اور پھر گھبرا گئے۔ کیوں کر راستا ان کے پیروں کے پاس نمودار ہوا تھا۔ انھوں نے دیکھا، سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ وہ سیڑھیاں اُترتے چلے گئے۔

نیچے ایک بڑا ہال تھا۔ اس میں ہر طرف میزیں اور

کرسیاں بچھی تھیں۔ بہت سی میزوں پر لوگ بیٹھے جوا
کھیل رہے تھے۔ ایک میز پر انھیں راشا بیٹھا نظر آیا۔
لیکن وہ بالکل اکیلا تھا۔ اور آنکھیں بند کیے۔ کرسی کی
پشت پر سر ٹکائے نیم دراز تھا۔ وہ اس کی طرف قدم
اٹھانے لگے۔ اور پھر کرسیاں گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے
راشا کے ہونٹ ہلتے دیکھے:

"نہیں بھئی۔ میں آج نہیں کھیلوں گا۔ آپ کسی دوسری میز
پر چلے جائیں۔"

"لیکن کیوں نہیں کھیلیں گے مسٹر راشا؟" انسپکٹر جمشید بدلی
ہوئی آواز میں بولے۔

"موڈ نہیں ہے۔ میں نے آج ایک لمبا ہاتھ مارا ہے۔
مجھے جوا کھیلنے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔"

"لمبا ہاتھ۔ کیا مطلب؟" فاروق بولا۔

اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں، پھر انھیں الجھی ہوئی
نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا:

"میں ذرا نیند میں تھا۔ اس لیے کوئی غلط بات میرے
منہ سے نکل گئی۔ بات صرف اتنی ہے کہ آج میں بہت
تھکا ہوا ہوں۔ ذہن بھی تھک گیا ہے۔ اور تھکے ہوئے ذہن
سے جوا تو ہرگز نہیں کھیلا جا سکتا۔"

"ہوں۔ تو آپ نے کوئی لمبا ہاتھ نہیں مارا۔" فاروق نے
کہا۔

"نہیں۔ ہم بے چارے کیا لمبے ہاتھ ماریں گے۔" اس نے
بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔

"لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ ہمارے ساتھ کھیل لیتے۔"
انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"بھئی یہاں اور لوگ بھی تو موجود ہیں۔" اس نے بھنا کر
کہا۔

"لیکن۔ جو مزا آپ کے ساتھ کھیلنے میں ہے۔ وہ کسی اور
کے ساتھ آ ہی نہیں سکتا۔"

"ہوں! تو یہ بات ہے۔" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"کیا بات ہے۔ ہم تو نہیں سمجھے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ ہمیں کہاں لے جانا چاہتے ہیں۔" فاروق بولا۔

"باس کے پاس۔" وہ مسکرایا۔

"باس۔ کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"میں جانتا ہوں۔ یہ چونکنا مصنوعی ہے۔ اور تم لوگ بھی
دراصل باس کے چکر میں ہی یہاں تک آئے ہو۔"

"اگر تم نے پہچان ہی لیا ہے تو پھر چلو۔ لگے ہاتھوں

تمہارے باس سے بھی مل لیں۔" انسپکٹر جمشید نے پُرسکون آواز میں کہا۔

"ہاں! ابھی ابھی پہچانا ہے مسٹر انسپکٹر جمشید۔"

اس نے کہا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ قدم اُٹھانے لگے۔ ہال کی دیوار میں ایک دروازے کے پاس وہ رک گیا اور اُنگلی سے تین بار دستک دی، پھر بولا:

"راشا!"

"آجاؤ۔" اندر سے بھرائی ہوئی آواز سُنائی دی۔

دروازہ کھُل گیا۔ پہلے راشا اندر داخل ہوا، پھر وہ تینوں۔ انھوں نے دیکھا۔ اندر ایک ساٹھ سال کے لگ بھگ عمر کا آدمی بیٹھا تھا۔ اس کے سر کے تمام بال سفید ہو چکے تھے۔ اس کی آنکھوں پر تاریک شیشے کی عینک تھی۔ چہرے کی جلد سُنہری رنگت لیے تھی۔ ہاتھوں پر سیاہ دستانے تھے۔ اور منہ میں پائپ۔ اُنگلیوں میں ہیروں کی انگوٹھیاں تھیں:

"کیا ہم مسٹر جیدی سے مُلاقات کر رہے ہیں؟"

"ہاں بالکل۔ یہ لوگ کون ہیں راشا؟"

"انسپکٹر جمشید۔ فاروق اور اکرام۔" اس نے مشینی انداز میں کہا۔

"یہاں ان کا کیا کام؟"

"رجسٹر اور فائل جلانے کے سلسلے میں میرا ان سے آمنا سامنا ہوا تھا۔ یہ اب یہاں پہنچ گئے۔"

"ہوں۔ آپ کیا چاہتے ہیں انسپکٹر۔"

"وہ فائل اور رجسٹر کیوں جلوائے گئے ہیں۔" وہ بولے۔

"اس قسم کے جتنے کام کوئی چاہے۔ ہم سے لے سکتا ہے۔ بس ہمارا معاوضہ ادا کرنا شرط ہے۔" اس نے کہا۔

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو مسٹر جیدی۔ کہ کسی نے آپ سے یہ کام لیا ہے۔ اور اس کا معاوضہ ادا کیا ہے۔"

"ہاں! بالکل۔" اس نے فوراً کہا۔

"تب پھر آپ کو اس کا نام بتانا ہو گا۔"

"جیدی اپنے موکلوں کے نام بتانا بھی چاہے تو نہیں بتا سکتا۔" اس نے اداس سے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"اس سلسلے میں میرا ایک اور اصول ہے۔ جو لوگ مجھ سے کام لینا چاہتے ہیں۔ میں ان کا نام جاننے کی کبھی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ جو آدمی میرے سامنے آنا چاہے، میں اس کو بھی یہی پیغام دیتا ہوں کہ میرے سامنے نہ آئیں، پوشیدہ رہیں۔ لہٰذا جس نے بھی مجھ سے یہ کام لیا ہے۔ میں اس

کو واقعی نہیں جانتا۔"

"تب پھر آپ کو قانون کا مہمان بن کر رہنا ہوگا۔"

"اگر آپ لے جا سکتے ہیں مجھے تو لے جائیں۔ دراصل ریکارڈ روم سے واپسی پر راشا نے ساری بات مجھے بتا دی تھی۔ میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ آپ اب سیدھے یہاں آئیں گے۔ لہٰذا میں نے آپ کی آسانی کے لیے راشا کو ہال میں بٹھا دیا تھا۔" اس کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

"کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں مسٹر جیدی، کہ نہ تو ہم آپ کو یہاں سے لے جا سکتے ہیں اور نہ خود کو لے جا سکتے ہیں۔"

"میرے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ تجربہ کر کے دیکھ لیں۔" وہ مسکرایا۔

"گویا آپ قانون کے راستے میں رکاوٹ بنیں گے۔ آپ اس کا انجام جانتے ہیں۔"

"جانتا ہوں، لیکن میں ایک دوسری بات بھی جانتا ہوں اور وہ یہ کہ اس وقت آپ پوری طرح میرے جال میں ہیں اور آپ اس جال سے نکل نہیں سکتے۔ لہٰذا مجھے آپ سے اور قانون سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔"

"اگر اتنا یقین ہے تو پھر ایک بات سچ کیوں نہیں بتا

دیتے۔" انسپکٹر جمشید نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"کون سی بات۔ میرا خیال ہے۔ میں نے جھوٹی تو ایک بات بھی نہیں کہی۔"

"صرف یہ بتا دو۔ رجسٹر اور فائل جلانے کا کام تم سے کس نے لیا تھا؟"

"یہ سو فی صد سچ بات ہے کہ میں اس کا نام نہیں جانتا، دراصل میرا اصول ہی یہ ہے کہ میں اپنے موکلوں کے نام پتے جاننے کے چکر میں نہیں پڑتا۔ لہٰذا مجھ سے کام لینے والے مجھ پر بہت اعتبار کرتے ہیں۔"

"ہوں۔ خیر۔ اب بات صرف اتنی رہ گئی کہ ہمیں تم لوگوں کو گرفتار کرانا ہے۔ اور تم کہتے ہو کہ گرفتاری نہیں دیں گے۔ کیوں۔ صرف اتنی سی بات ہے نا۔"

"ہاں! ٹھیک ہے۔"

"ادھر میرا اصول ہے کہ تم جیسے لوگوں سے معاشرے کو پاک کیے بغیر نہیں رہتا۔ نہ جانے تم روزانہ کتنے نئے لوگوں کو جواری بنا رہے ہو۔ کتنے گھروں میں چولہے نہیں جلتے ہوں گے۔"

"تب تو معاملہ برابر کا ہو گیا۔ اب یا تو آپ یہاں سے نہیں جا سکیں گے۔ یا میں یہاں نہیں رہ سکوں گا۔" جیدی

مسکرایا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" انھوں نے کہا اور فوراً ایک قدم آگے بڑھ کر جیدی کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ ہاتھ ڈالنے کے فوراً بعد اسے اس قدر زور سے جھٹکا دیا کہ وہ اوندھے منہ دھب سے گرا۔ یہ دیکھ کر راشا گھبرا گیا، اس نے دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی، لیکن فاروق کی ٹانگ کام آئی۔ وہ دھڑام سے گرا، اس وقت تک اکرام اس تک پہنچ چکا تھا۔ اس کی ٹھوکر راشا کے سر پر لگی اور وہ ساکت ہو گیا۔

اتنی دیر میں جیدی اٹھ چکا تھا۔ اس کے ناک سے خون بہ رہا تھا۔ چہرہ حد درجے بھیانک لگ رہا تھا۔

"میں ۔ میں تمھیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" اس نے خوفناک لہجے میں کہا اور ان پر چھلانگ لگا دی۔ وہ یک دم ایک طرف ہو گئے۔ اور جیدی پھر فرش پر آ رہا۔

"بس ۔ اس برتے پر کہتے تھے۔ ہمیں یہاں سے جانے نہیں دو گے۔" انسپکٹر جمشید نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

"کیوں ۔ آپ مایوس کس بات پر ہو گئے؟"

"میں سمجھا تھا ۔ شاید کوئی زبردست لڑائی لڑنا پڑے گی، لیکن یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔"

"چلیے خیر ۔ کوئی بات نہیں ۔ پھر کبھی زبردست لڑائی لڑیں گے ۔ اس وقت تو آپ پولیس کو فون کریں۔"

ایک گھنٹے کے بعد جوئے خانے پر پولیس کا قبضہ ہو چکا تھا اور جیدی کمرۂ امتحان میں موجود تھا ۔ اس کے سر پر جدید آلہ فٹ کیا جا چکا تھا ۔ اور اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار صاف نظر آ رہے تھے:

"یہ ۔ یہ آپ لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کرنے لگے ہیں ۔ میرے جرائم تو بالکل ظاہر ہیں۔"

"ظاہر باتوں کے لیے کون اتنی محنت کرتا ہے مسٹر جیدی، ہم تو آپ سے صرف اس شخص کا نام معلوم کرنا چاہتے ہیں، جس نے آپ کے ذمے رجسٹر اور فائل جلانے کا کام لگایا تھا۔"

"میں بتا چکا ہوں، میں اس کا نام نہیں جانتا ۔ نہ میں ایسے کسی آدمی کا نام معلوم کرتا ہوں، یہ میرا بہت پرانا اصول ہے اور اس اصول کی بنا پر لوگ مجھ سے ایسے کام بے دھڑک لیتے ہیں۔"

"ہوں ۔ ٹھیک ہے ۔ میں سمجھ گیا ۔ تم امتحان سے گزرے بغیر نہیں بتاؤ گے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیسی بات کرتے ہیں ۔ میں بتا چکا ہوں۔" اس نے

چیخ کر کہا۔

"لیکن —" انسپکٹر جمشید لیکن کہہ کر رک گئے اور اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"لیکن کیا؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔

"میرا اندازہ ہے کہ تم کچھ نہ کچھ ضرور چھپا رہے ہو۔ دراصل میں لوگوں کے چہروں کے تاثرات کو جانچنے کا ماہر ہوں — کیا تم اس بات سے بھی انکار کرو گے مسٹر جیدی؟"

جیدی دھک سے رہ گیا، پھر اس نے کانپتی آواز میں کہا:

"نن — نہیں — میں انکار نہیں کر سکتا۔"

"تب پھر بتاؤ — تم کیا چھپا رہے ہو؟"

"نہیں بتاؤں گا — میں نے ابھی ابھی ایک فیصلہ کیا ہے۔" جیدی یہ کہہ کر زور سے ہنسا۔

"کیسا فیصلہ؟" انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

"اپنی زندگی کا آخری اور بہت شان دار فیصلہ۔"

"آخر کیا — یہ بھی تو بتاؤ۔" انسپکٹر جمشید بلند آواز میں بولے۔

"یہ کہ — میں تمھیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم نہ بتاؤ۔"

"اچھا تو پھر تم اپنا زور لگا لو — میں اپنی قوتِ برداشت کو آواز دیتا ہوں۔" اس نے کہا۔

آلے کا بٹن دبا دیا گیا — جیدی کا چہرہ سرخ ہوتا چلا گیا — پھر وہ بری طرح چلانے لگا، لیکن اس نے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالا — یہاں تک کہ اس کا جسم ساکت ہو گیا:

"بہت سخت نکلا۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"اب — اب آپ کیا کریں گے؟"

"ہوش میں لا کر نئے سرے سے کوشش کریں گے۔"

انھوں نے رات بھر کوشش جاری رکھی — یہاں تک کہ دن کا اجالا پھیل گیا — اور انسپکٹر جمشید مایوس ہو گئے — انھوں نے تھکی تھکی آواز میں کہا:

"جیدی — تم جیت گئے — کاش تم نے یہ ساری تکلیف کسی نیک مقصد کے لیے برداشت کی ہوتی — ملک اور قوم کے لیے تم نے یہ جذبہ دکھایا ہوتا — مم — مگر — تم تو — ایک جرائم پیشہ ہو — لوگوں کے گھر اجاڑنے والے ہو — تم سے نیکی کی امید کس طرح رکھی جا سکتی ہے۔"

"خود میں بھی اپنے آپ سے نیکی کی امید نہیں رکھتا۔"

اس نے کہا۔

"اچھا — ہم جا رہے ہیں — جو بات تم نہیں بتائی — وہ ہم دوسرے طریقے سے معلوم کر لیں گے۔"

"ضرور — کیوں نہیں — مجھے اس کی کیا پروا — میرے لیے تو خوشی کی بات یہ ہے کہ میں — انسپکٹر جمشید جیسے انسان کے چہرے پر ناکامی کے آثار صاف دیکھ رہا ہوں۔"

"ہاں! یہ ٹھیک ہے — میں اعتراف کرتا ہوں — اس معاملے میں تم نے مجھے شکست دے دی ہے — یہ فتح تمھیں مبارک ہو — لیکن اس فتح کا تمھیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا — تھوڑی دیر کی خوشی ضرور تم محسوس کرو گے، پھر یہ خوشی تمھیں غم کی وادی میں دھکیل دے گی — ایک ایسی وادی میں جس سے تم نہیں نکل سکو گے — آؤ بھئی چلیں۔"

وہ وہاں سے نکل کر گھر پہنچے — بیگم جمشید سر میز پر ٹکائے بیٹھی تھی۔ انھیں گھر کا دروازہ کھلا ملا تھا:

"خیر تو ہے — دروازہ کیوں کھلا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے پریشان ہو کر کہا۔

"اوہ — آپ آ گئے — محمود، فرزانہ، پروفیسر صاحب اور خان رحمان صاحب ابھی ابھی کہیں گئے ہیں — کسی کا فون

آیا تھا۔"

"اوہ — تو کیا وہ بتا کر نہیں گئے — فون کس کا آیا تھا؟"

"جی — جی نہیں۔"

"میں ابھی معلوم کر لیتا ہوں۔" انھوں نے کہا اور جلدی جلدی کنور لیاقت کے نمبر ملائے، لیکن دوسری طرف سے کوئی آواز سنائی نہ دی — شاید کنور لیاقت کے فون میں کوئی خرابی واقع ہو چکی تھی —

"اس کا مطلب ہے — ہمیں بھی اب وہیں جانا ہو گا۔"

"تت — تو کیا — آپ بھی — ناشتا نہیں کریں گے؟"

"ناشتا — ناشتا ضرور کریں گے — لیکن پہلے کیس کا ناشتا تو کر لیں امی جان۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"کک — کیس کا ناشتا — ہائیں۔" بیگم جمشید حیران رہ گئیں۔

اور وہ پھر گھر سے نکل آئے — جلدی جلدی گاڑی میں بیٹھ کر باہر نکلے، لیکن پھر ٹھٹک کر رک گئے —

ایک شخص ان کی کار کے آگے کھڑا تھا اور عجیب سی نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا —

"کیا بات ہے جناب؟"

"میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ کا نام؟" انھوں نے پوچھا۔

"مم - میں - آپ نے مجھے پہچانا نہیں" اس کے لہجے میں
حیرت تھی -

"اوہ ہاں - یاد آیا - آپ افراسیاب ہیں نا - کنور لیاقت
کے دوست - ان کی کوٹھی کے ایک کمرے میں آپ سے
ملاقات ہوئی تھی"

"ہاں بالکل!" اس نے فوراً کہا۔

"فرمائیے - کیسے آنا ہوا؟"

"چند ضروری باتیں آپ سے کرنے کی خواہش محسوس کر رہا
ہوں - اس لیے چلا آیا ہوں، لیکن اگر آپ کے پاس وقت
نہیں ہے تو میں پھر کسی وقت حاضر ہو جاؤں گا۔" اس نے
کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں - آئیے"

وہ کار سے اُتر کر گھر کی طرف مڑ گئے - جلد ہی وہ
ڈرائنگ روم میں بیٹھ چکے تھے:

"ہاں! اب فرمائیے - آپ کیا کہنا چاہتے ہیں"

"میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں - کنور لیاقت بالکل فراڈ
ہے - دھوکے باز ہے - فریبی انسان ہے - اس نے یہ
ساری دولت"

"ایک منٹ جناب - ایک منٹ - آپ اپنے دوست کے

بارے میں ایسی باتیں کہہ رہے ہیں" انسپکٹر جمشید نے گھبرا کر
کہا۔

"ہاں جناب - میں کیوں نہ کہوں - میں اس کا دوست
ضرور ہوں، لیکن اس کے طریقوں کو بالکل پسند نہیں کرتا،
میں نے زندگی کے ہر موڑ پر اسے سمجھانے کی کوشش کی،
ابھی اس کی بچّی بھی اغوا نہیں ہوئی تھی - اس وقت بھی
میں نے اسے ناجائز طریقوں سے دولت حاصل کرنے سے
منع کیا، لیکن اس نے میری ایک نہ سُنی - اس نے ہر
ناجائز طریقے سے دولت حاصل کرنے کی ٹھان رکھی تھی،
ان حالات میں اس کی بچّی کو اغوا کیا گیا - میں نے اسے
سمجھایا - کہ یہ قدرت کی طرف سے ایک وارننگ ہے -
اسے خبردار کیا گیا ہے - اب بھی وقت ہے - سنبھل جاؤ -
سمجھ جاؤ - لیکن نہ تو وہ سنبھلا اور نہ اس نے سمجھنے کی
کوشش کی - دولت کے انبار تلے اس نے اپنی بچّی کے
غم کو بھی دبا دیا - سولہ سال گزر گئے، لیکن وہ اب
تک دولت پر دولت جمع کرنے کے چکر میں ہے - آج
جب اس کی بچّی اسے مل گئی تو مجھے محسوس ہوا - اب وہ
اور بھی فرعون بن جائے گا - لہذا کیوں نہ کسی طرح اسے
روک دیا جائے - پہلے تو میں خود ذہن پر زور دیتا رہا

کہ کس طرح اسے روکا جائے۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا
تو میں نے آپ کے پاس آنے کا فیصلہ کیا۔ وہ میرا دوست
ہے۔ میں اس کا ہمدرد ہوں۔ لیکن وہ خیال کرتا ہے،
میں اس کے دولت مند ہو جانے سے جلنے لگا ہوں۔ اس
لیے میری کوئی بات اس پر اثر نہیں کرتی۔" یہاں تک کہہ
کر وہ خاموش ہو گیا۔

"ہوں۔ آپ کی باتوں نے ہمیں بہت متاثر کیا ہے۔
خیر آپ فکر نہ کریں۔ ہم انھی کی طرف جا رہے تھے۔ اور
انھیں سمجھانے کی پوری کوشش کریں گے۔ ویسے کیا آپ کو
معلوم ہے۔ انھوں نے کس کس ناجائز طریقے سے دولت جمع
کی ہے؟"

"جی ہاں۔ کیوں نہیں۔ میں نے تو پورا ریکارڈ جمع کر
رکھا ہے۔ ایک ایک تفصیل میرے پاس درج ہے۔ میرا
دوست عمارات اور پلوں وغیرہ کے ٹھیکے لیتا ہے۔ اور کروڑوں
روپے کی بے ایمانی کرتا ہے۔ اس کے تعلقات شہر
کے بڑے بڑے لوگوں سے ہیں۔ ان کی مدد سے وہ یہ
ٹھیکے وصول کرتا ہے۔ ان کی بھی جیبیں گرم کرتا ہے۔
لیکن اب جب کہ اس کی بچی مل گئی ہے۔ اور اب اس قدر
دولت اس کے کسی کام بھی نہیں آئے گی۔ تو ان حالات میں

تو اسے رک جانا چاہیے۔ آخر اب وہ اس قدر دولت کو
کیا کرے گا۔ اس ایک بچی کے سوا اور کوئی بھی تو نہیں
ہے اس کا۔ ایک دن یوں ہی مر جائے گا۔ تو ساری دولت
اس بچی کی ہو گی۔ اور پھر وہ اس دولت کو کس طرح اڑائے
گی۔ یہ ہم سوچ ہی سکتے ہیں۔"

"آپ کی سب باتیں بالکل سچ ہیں۔ اور ہم کوشش کریں
گے کہ۔ مسٹر کنور لیاقت کی سوچ کو بدل دیں۔ اگر آپ
پسند کریں تو آپ بھی ہمارے ساتھ چل سکتے ہیں۔" انھوں
نے کہا۔

"نہیں۔ وہ مجھے آپ کے ساتھ دیکھ کر چڑ جائے گا۔" اس
نے نفی میں سر ہلایا۔

"اچھی بات ہے۔ آپ کی آمد کا مقصد نیک ہے۔"
یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے، پھر رک کر بولے:
"آپ کیا کام کرتے ہیں مسٹر افراسیاب؟"

"م۔ میں۔ جی میں بھی ایک ٹھیکے دار ہوں۔" اس نے
کہا۔

"شکریہ۔ اب ہم چلیں گے۔ آپ مسٹر کنور لیاقت کے بارے
میں مکمل معلومات مجھے بھیج دیجیے گا۔"
"آپ ان کے خلاف قانونی کارروائی تو نہیں کریں گے نا؟"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔" وہ بولے۔

"میرا نام درمیان میں تو نہیں آئے گا۔" افراسیاب کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

"نہیں آئے گا۔ بے فکر رہیں۔"

"بہت بہت شکریہ۔"

باہر آ کر وہ ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

"اس کی آمد کا مقصد سمجھ میں نہیں آیا۔" اکرام بڑبڑایا۔

"یا تو یہ واقعی کنور لیاقت کا ہمدرد ہے یا پھر کاروباری رقیب ہے۔ اور چاہتا ہے کہ دوستی کے پردے میں اس کی ٹھیکیداری منسوخ کرا دے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہوں۔ لیکن ابا جان۔ اس کی باتوں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ کنور لیاقت واقعی زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کے لیے ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرتا رہا ہے۔" فاروق بولا۔

"ہاں! یہ اندازہ میں بھی لگا چکا ہوں۔ اور شاید قدرت نے اس کی بیٹی بھی اسی لیے اس سے جدا کر دی تھی۔ سولہ سال بعد اب بیٹی ملی ہے۔ تو اسے چاہیے۔ تمام ناجائز طریقے چھوڑ دے۔"

ان کی کار تیزی سے راستا طے کر رہی تھی۔ اچانک

انھوں نے کار ایک فون بوتھ کے سامنے روک دی اور بوتھ میں داخل ہو کر کنور لیاقت کے نمبر ڈائل کیے۔ رابطہ ملنے پر موجو بھائی کا پتا پوچھ کر نوٹ کیا اور پھر گاڑی میں آ بیٹھے۔

"کیوں ابا جان۔ کیا ہم کنور لیاقت کی طرف نہیں چل رہے؟" فاروق نے انھیں راستا تبدیل کرتے دیکھ کر حیرانی سے پوچھا۔

"چل تو رہے ہیں۔ مجھے ایک اور خیال آ گیا۔ اور وہ خیال ہے موجو بھائی کا۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ دس لاکھ روپے لے کر بحفاظت گھر تک پہنچ گیا یا نہیں۔"

"اوہ۔ اچھا۔" ان کے منہ سے نکلا۔

آخر وہ مجاہد آباد پہنچ گئے۔ گلی نمبر ۱۱ کے مکان نمبر ۱۰ پر فاروق نے دستک دی۔ تیسری دستک پر دروازہ کھلا۔ اور موجو بھائی کی صورت نظر آئی، لیکن اس کے چہرے پر سیاہی دوڑ رہی تھی۔ آنکھوں میں وحشت تھی۔ اور جسم میں لرزا۔

"خیریت تو ہے۔ موجو بھائی۔"

"خیریت۔ یہاں کہاں۔" اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"کیوں۔ کیا ہوا۔ جلدی بتائیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

ساتھ ہی وہ اندر داخل ہو گئے۔ اندر ایک عورت بیٹھی
سسک رہی تھی:

"معلوم ہوتا ہے۔ آپ لوگوں کے ساتھ کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔"

"ہاں۔ وہ۔ وہ دس لاکھ۔" موجو بھائی نے روتے ہوئے
کہا۔

"کیا ہوا۔ دس لاکھ کو؟" فاروق چونکا۔

"وہ۔ وہ مجھ سے کوئی اُچک لے گیا۔"

"کیا!!!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

اس کے پیچھے

سونیا نے اس سے صرف اتنا کہا تھا:

"فوراً یہاں آ جائیں۔"

اور پھر اس نے ریسیور رکھ دیا تھا۔ ان حالات میں
وہ فوراً وہاں پہنچنے کے سوا اور کر بھی کیا سکتے تھے، لہٰذا
خان رحمان کو لے کر پہنچ گئے۔ جب وہ کوٹھی کے سامنے
پہنچے۔ وہاں۔ موت کا سناٹا طاری تھا۔ باہر کوئی بھی
شخص نظر نہیں آ رہا تھا۔ محمود نے آگے بڑھ کر دستک
دی تو دروازہ سونیا نے کھولا۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی
کا دور دورہ تھا:

"کیا ہوا سونیا صاحبہ؟"

"اندر آ کر دیکھ لیں۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

وہ اس کے پیچھے اندر داخل ہوئے۔ سونیا کا رُخ
کنور لیاقت کے کمرے کی طرف تھا۔ انھیں ایک عجیب

سا احساس ہوا۔ دل دھڑکنے لگے۔ آخر وہ کنور لیاقت کے
کمرے کے دروازے تک پہنچ گئے۔ دروازہ بند تھا۔
وہاں رکتے ہوئے وہ ان کی طرف مڑی اور دبی آواز
میں بولی:

"میں نے صرف آپ کو فون کیا ہے۔ اور کسی کو اطلاع
نہیں دی اور نہ گھر میں ابھی تک کسی کو بتایا ہے۔" اس کا
لہجہ حد درجے پُر اسرار تھا۔

"لیکن کیا۔ بات کیا ہے؟" محمود نے حیرت زدہ ہو کر
پُوچھا۔

"آیئے۔ خود ہی دیکھ لیں۔" اس نے کہا، یہ کہ کر اس
نے تالے کے سوراخ میں چابی گھمائی اور دروازہ کھول
دیا۔ وہ اندر داخل ہوئے اور پھر ان کے اُوپر کے
سانس اُوپر اور نیچے کے نیچے رہ گئے۔

کنور لیاقت کمرے کے فرش پر مُردہ پڑا تھا۔
ایک خنجر اس کی کمر میں دستے تک پیوست تھا۔ اس کے
جسم کا خون فرش کے دروازے تک پھیل چکا تھا۔

"اُف مالک۔ یہ کیا ہوا۔ صبح تو ہم انھیں ٹھیک ٹھاک
حالت میں چھوڑ کر گئے تھے۔ انھوں نے موجو بھائی کو
چیک بھی دیا تھا۔" محمود نے تھرتھر کانپتی آواز میں کہا۔

"ہاں! اس کے بعد یہ اپنے کمرے میں آ گئے تھے۔
کچھ دیر پہلے میں ان کے کمرے میں داخل ہوئی تو یہ منظر
دیکھا۔ میں نے فوراً دروازہ بند کر دیا اور آپ کو فون
کر دیا۔"

"آپ نے اس خنجر کو ہاتھ تو نہیں لگایا؟"

"صرف خنجر کو ہی نہیں۔ کسی چیز کو بھی ہاتھ نہیں
لگایا۔" اس نے کہا۔

"یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ پہلے ہم ماہرین کے لیے
فون کریں گے۔ اس کے بعد لاش اور کمرے کا جائزہ
لیں گے۔" فرزانہ نے جلدی جلدی کہا۔

محمود نے ماہرین کو فون کیا اور پھر لاش کی طرف
متوجہ ہوئے۔

"سب سے پہلا سوال تو یہ ہے کہ قاتل کمرے میں داخل
کس طرح ہوا؟"

"میں جب کمرے میں داخل ہوئی۔ تو دروازہ اندر سے
بند نہیں تھا۔ اور باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکی بھی کھلی
ہوئی تھی۔ قاتل اگر باہر کا کوئی آدمی ہے تو وہ ضرور
باغ میں سے ہو کر اس کھڑکی کے ذریعے اندر داخل
ہوا ہو گا۔ گھر کے آدمیوں میں میرے اور ملازمین کے

علاوہ اور ہے ہی کون ۔ لہٰذا میں ہی قاتل ہوں گی۔" اس
نے پُر سکون آواز میں کہا۔

"اگر آپ قاتل ہیں تو آپ بھی نہیں بچ سکیں گی۔"
محمود نے خشک لہجے میں کہا۔

"سولہ سال بعد باپ کا منہ دیکھا تھا ۔ وہ بھی صرف ایک
دن بلکہ چند گھنٹوں تک دیکھ سکی ۔ اور اب باپ بھی دوسری
دنیا میں چلا گیا ۔ ان حالات میں جی کر کیا کروں گی ۔
بہتر ہو گا ۔ کہ آپ بطور قاتل مجھے ہی گرفتار کر لیں۔" اس
نے سرد آواز میں کہا۔

"اگر آپ قاتل نہیں ہیں تو ہم آپ کو کس طرح گرفتار کر
سکتے ہیں۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"کیا کہا ۔ آپ نے؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"کیوں ۔ کیا میں نے کوئی عجیب بات کہ دی۔" فرزانہ
نے اس کی طرف دیکھا۔

"اس ملک میں مجرم ہونا ضروری نہیں ۔ اگر آپ نے
جرم نہیں کیا ۔ آپ قاتل نہیں ہیں ۔ پولیس آپ کو
گرفتار کر سکتی ہے ۔ بس اسے ذرا سا شک ہونا چاہیے،
یا مقتول پارٹی کی طرف سے لکھوائی جانے والی رپورٹ
میں آپ کا نام ہونا چاہیے ۔ پھر آپ کو قاتل کے

طور پر پولیس ضرور گرفتار کرے گی ۔ چاہے آپ قاتل
نہ ہوں ۔ آپ ایک دو سال تک جیل میں رہیں گے اور
پھر عدالت میں پیشیاں بھی بھگتیں گے ۔ یہ اور بات ہے
کہ عدالت آپ کو باعزت طور پر بری کر دے ۔
لیکن اس وقت تک تو آپ خود کو اچھا بھلا مجرم خیال
کرنے لگیں گے۔" اس نے جلدی جلدی طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہاں! آپ کی باتیں بھی ٹھیک ہی ہیں۔"

"ہم ۔ میرا خیال ہے ۔ خنجر پر انگلیوں کے واضح
نشانات موجود ہیں۔" فرزانہ کی آواز ابھری۔

"اوہ! اس کا مطلب ہے ۔ قاتل نے اپنی انگلیوں کے
نشانات مٹانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔" محمود بولا۔

"یا پھر اسے موقع ہی نہیں ملا ہے مٹانے کا۔"

"ایک قاتل کے لیے اس سے زیادہ ضروری کام کوئی بھی
نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی انگلیوں کے نشانات مٹا دے ۔
وہ جان پر کھیل کر بھی یہ کام ضرور کرتا ہے ۔ اور
میرا خیال ہے ۔ یہاں تو اسے بہت موقع حاصل تھا ۔
کیوں کہ اب تک تو گھر کے افراد کو علم بھی نہیں ہوا۔"

"ہوں ۔ بھلا میں کیا کہ سکتی ہوں کہ اس نے نشانات
کیوں نہیں مٹائے ۔ ہو سکتا ہے ۔ بھول گیا ہو۔" سونیا بولی۔

"فرزانہ! تم باغ کی طرف جاؤ۔ کھڑکی کے نیچے دیکھو۔ وہاں جوتوں کے نشانات ہیں یا نہیں۔" محمود نے اس سے کہا۔

"اچھی بات ہے۔" اس نے کہا اور بیرونی دروازے کی طرف چلی گئی۔

محمود کمرے کی باقی چیزوں کو بغور دیکھنے لگا۔ خان رحمان بھی اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ اچانک انھوں نے کہا:

"ان۔ ان کے بالوں میں ایک دھاگا اُلجھا ہوا ہے۔"

"یہ کیا خاص بات ہے۔" سونیا نے منہ بنایا۔

"او ہو۔ اچھا۔" محمود نے حیرت زدہ ہو کر کہا اور پھر کنور لیاقت کے بالوں کو غور سے دیکھا۔ ہلکے نیلے رنگ کا ایک بڑا سا دھاگا اس کے بالوں میں پھنسا ہوا تھا۔

"کنور لیاقت کے جسم پر اس وقت سُرخ رنگ کا لباس ہے۔ جب کہ یہ دھاگا ہلکے نیلے رنگ کا ہے۔ اس کا مطلب ہے، یہ دھاگا ان کے لباس کا نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے۔ یہ قاتل کے لباس کا ہو۔"

"اوہ!"

"مزا آگیا۔ میں اس وقت زرد رنگ کے لباس میں ہوں۔" سونیا نے جلدی سے کہا۔

"معاف کیجیے گا مس سونیا۔ آپ نے یہ بات کیوں کی؟"

"کیوں۔ کیا آپ مجھ پر شک نہیں کر رہے۔ آپ ضرور شک کریں گے۔ تو میں خود کیوں یہ بات واضح نہ کر دوں کہ میرے جسم پر زرد رنگ کا لباس ہے۔"

"اور آپ لباس تبدیل بھی کر سکتی ہیں۔" محمود مسکرایا۔

"اوہ!" اس کے منہ سے نکلا۔

"گویا آپ مجھ پر شک کر کے رہیں گے۔"

"نہیں۔ ہم نہیں کریں گے۔ آپ تو ان کی بیٹی ہیں ایسی بیٹی۔ جو سالوں بعد ان سے ملی ہیں۔ آپ کیوں لگیں انھیں قتل کرنے۔" خان رحمان بولے۔

"بہت بہت شکریہ۔ کسی نے تو میری طرف کی بات کہی۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

اسی وقت قدموں کی آواز اُبھری۔ انھوں نے دیکھا۔ فرزانہ چلی آ رہی تھی:

"کھڑکی کے نیچے جوتوں کے واضح نشانات ہیں۔" فرزانہ نے اعلان کیا۔

"عجیب قاتل تھا۔" یہ سُن کر محمود بڑبڑایا۔

"کیوں۔ کیا بات ہے؟"

"خنجر پر بھی اپنی اُنگلیوں کے واضح نشانات چھوڑ گیا۔"

اور کھڑکی کے نیچے اپنے جوتوں کے بھی۔ کیا وہ کوئی بالکل اناڑی قاتل تھا؟"

"ہو سکتا ہے یہی بات ہو۔"

"کیوں نہ پولیس اور ماہرین کے آنے سے پہلے پہلے ہم گھر کے ملازمین سے بھی دو دو باتیں کر لیں۔" فرزانہ نے کہا۔

"ضرور کیوں نہیں۔" محمود فوراً بولا۔

ملازمین کو اس کمرے سے کچھ دور بلا لیا گیا۔ ابھی تک انھیں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ کنور لیاقت کو قتل کر دیا گیا ہے۔ ان کے آنے کے بعد پہلے تو انھوں نے ان کے لباس دیکھے، پھر قدموں کے نشانات چیک کیے گئے۔ ان میں سے کسی کے جسم پر ہلکا نیلا لباس نہیں تھا۔ اور نہ جوتوں کے نشانات ان نشانات سے ملتے جلتے تھے، جو کھڑکی کے نیچے پائے گئے تھے۔

"اب میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ دھاگا ضرور قاتل کے لباس کا ہے۔" محمود بولا۔

"ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں۔ ہو سکتا ہے۔ اس دھاگے کا اس معاملے سے کوئی بھی تعلق نہ ہو۔" فرزانہ نے انکار میں سر ہلایا۔

"کیوں۔ کیسے؟"

"ایسا دھاگا تو ہوا کے ساتھ اڑ کر بھی سر کے بالوں میں الجھ سکتا ہے۔"

"کیوں محترمہ سونیا۔ کیا آج صبح کنور صاحب گھر سے باہر گئے تھے؟"

"جی نہیں۔ یہ کہیں نہیں گئے۔"

"بس تو پھر۔ گھر کے اندر تو دھاگا اڑ کر بالوں میں نہیں چپک سکتا تھا۔ لہٰذا زیادہ امکان یہی ہے کہ یہ قاتل کے لباس کا ہو گا۔"

"جہاں تک مجھے یاد ہے۔ ہم نے اس کیس کے دوران ایک شخص کو نیلے رنگ کے لباس میں دیکھا تھا۔" ایسے میں پروفیسر داؤد بولے۔

"اوہو اچھا۔ کیا آپ نے مہمانوں میں سے کسی کا لباس نیلا دیکھا تھا؟" فرزانہ چونکی۔

"ہاں! وجد بھائی کا۔" وہ بولے۔

"بالکل ٹھیک۔ میں بھی یہی کہنے والا تھا۔" خان رحمان نے کہا۔

"خیر۔ ہم اسے بھی چیک کریں گے۔"

اور پھر پولیس کی گاڑیوں کا شور گونجا۔ ماہرین اور پولیس

والے اندر آ گئے۔ انھوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔
لاش اور خنجر کی تصاویر لینے کے بعد مقتول کو اٹھایا گیا،
اور پھر ان سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ محمود اور
فرزانہ کی آنکھوں میں بے پناہ جوش نظر آیا۔ لاش کے
نیچے ایک چیز پڑی تھی اور وہ اس کو اچھی طرح پہچانتے
تھے۔

○

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں موجو بھائی؟" انسپکٹر جمشید نے
حیرت زدہ انداز میں کہا۔

"ہاں! میں ٹھیک کر رہا ہوں۔ میں نوٹوں کا بیگ
لیے بنک سے نکلا اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ کنور لیاقت
کا آدمی وہیں سے مجھ سے رخصت ہو گیا۔ ٹیکسی تھوڑی
دور تک تو بالکل ٹھیک چلتی رہی۔ پھر اس نے دو
تین جھٹکے کھائے۔ اور رک گئی۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور
سے پوچھا۔ کیا بات ہے؟ اس نے بتایا۔ گاڑی میں
کچھ خرابی ہو گئی ہے۔ تھوڑا سا دھکا لگانا پڑے گا۔
میں دھکا لگانے کے لیے نیچے اتر گیا۔ میرے دھکا لگانے

سے گاڑی آہستہ آہستہ رینگنے لگی، پھر اچانک وہ سٹارٹ ہو
گئی۔ اس نے ایک جھٹکا کھایا اور بلا کی رفتار سے آگے
بڑھ گئی۔ میں ارے ارے ہی کرتا رہ گیا۔ ٹیکسی کی طرف
دوڑا بھی۔ لیکن وہ تو ہوا ہو چکی تھی۔ میری چیخ و پکار
سن کر کچھ لوگ میرے گرد جمع ہو گئے۔ میں نے چیخ
کر کہا۔ وہ۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور میری رقم لے کر بھاگ
نکلا۔ اردگرد جمع لوگ چونک اٹھے۔ ایک بولا، کتنی رقم تھی؟
میں نے فوراً کہ دیا، دس لاکھ۔ بس پھر کیا تھا۔ بہت
لوگ اپنی موٹر سائیکلیں اور کاریں اس طرف دوڑانے لگے،
لیکن مجھے کسی نے ساتھ لے جانے کی کوشش نہیں کی۔
اور تنگ ہار کر میں کنور لیاقت کی کوٹھی کی طرف چل پڑا۔"

"کیوں۔ آپ کو تو پولیس اسٹیشن جانا چاہیے تھا۔"

"مجھ جیسے برے حال آدمی کی بات پر کون اعتبار
کرتا۔ کہ میرے پاس دکھ روپے تھے، میں نے سوچا۔
کنور صاحب کے ذریعے رپورٹ درج کراؤں گا۔ کوٹھی کا
دروازہ کھلا تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ اندرونی دروازہ
بند نظر آیا۔ لیکن باغ والی کھڑکی کھلی تھی۔ میں سوچے
سمجھے بغیر اس طرف چلا گیا۔ کھڑکی سے اندر جھانکا تو ایک
ہولناک منظر نظر آیا۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا، اس کے

چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آئے۔

"کیا دیکھا آپ نے؟" فاروق بے تاب ہو کر بولا۔

"اندر کنور لیاقت مردہ پڑے تھے۔ ان کی کمر میں ایک خنجر دستے تک پیوست تھا۔"

"کیا!!!" وہ ایک ساتھ بولے۔

"جی ہاں! پہلے میں نے یہ خیال کیا کہ شاید ابھی ان میں جان باقی ہو۔ لہٰذا جلدی سے کھڑکی پھلانگ گیا۔ ان پر جھک کر میں نے خنجر کا دستہ پکڑ لیا۔ اور خنجر نکالنا چاہا، لیکن اسی وقت قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں ڈرا کہ کہیں یہ قتل میرے ذمے نہ پڑ جائے۔ بس میں فوراً کمرے سے باغ میں کود گیا اور وہاں سے نکلا چلا آیا۔ اور سیدھا اپنے گھر آ گیا۔ یہ ہے میری عبرتناک کہانی۔ دس لاکھ بھی ہاتھ سے گئے۔ پلی پلائی بیٹی بھی گئی، شاید یہی میرے گناہوں کی سزا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ رونے لگا۔

"آپ نے کیا بتایا موجو بھائی۔ خنجر کو دستے پر سے آپ نے پکڑ لیا تھا؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی ہاں! بالکل۔"

"یہ آپ نے برا کیا۔ اب قتل کا شک آپ پر بھی کیا

جا سکتا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"لیکن کیوں۔ میں نے آپ کو ساری بات بتا دی ہے۔"

"مجھے بتانے کی بجائے۔ آپ کو سیدھے پولیس اسٹیشن جانا چاہیے تھا۔ وہاں جا کر آپ ساری بات بتاتے۔"

"تو کیا ہوا۔ آپ بھی تو سرکاری آفیسر ہیں۔"

"خیر۔ دیکھیں کیا بنتا ہے۔ آپ اس ٹیکسی کا نمبر تو پڑھ نہیں سکے ہوں گے۔"

"جی نہیں۔ یہ کسے معلوم تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور کی نیت خراب ہو چکی ہے۔ شاید وہ بنک میں مجھے داخل ہوتے دیکھ چکا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے بنک کے اندر آ کر دیکھ لیا ہو کہ میں ایک بڑی رقم وصول کر رہا ہوں۔ وہیں سے اس نے یہ پروگرام بنا لیا ہوگا۔"

"ہوں۔ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اچھا۔ ٹیکسی ڈرائیور کا حلیہ کیا تھا؟"

"حلیہ ہاں۔ میں اس کا حلیہ بتا سکتا ہوں۔ وہ پکے رنگ کا آدمی تھا۔ گہری سیاہ آنکھیں۔ ناک پھولا ہوا۔ ہاتھ موٹے اور بھدے۔ چہرے پر خوفناک سی مونچھیں۔ پیشانی چوڑی۔ چہرہ لمبائی لیے ہوئے۔"

"شکریہ۔ فاروق۔ تم حلیہ نوٹ کر چکے؟"

"جی ہاں ! بالکل۔"

"بس تو پھر جاؤ — اس حلیے کے ٹیکسی ڈرائیور کو تلاش کرو۔"

"جج — جی — کیا فرمایا — اس حلیے کے ٹیکسی ڈرائیور کو تلاش کروں۔" فاروق بھونچکا رہ گیا۔

"ہاں بھئی — آخر وہ ان کے دس لاکھ روپے لے کر بھاگا ہے۔"

"لیکن ابا جان — اسے تلاش کرنا تو پولیس کا کام ہے۔"

"آج تم بھی اس کام کو اپنا کام سمجھ لو۔" وہ مسکرائے۔

"جیسے آپ کی مرضی — جو آپ فرمائیں، سمجھ لوں گا۔" اس نے بُرا سا منہ بنا کر کہا اور اٹھ کھڑا ہوا — ابھی اس نے دروازہ نہیں کھولا تھا کہ گھنٹی کی آواز سُنائی دی — فاروق زور سے چونکا — ادھر انسپکٹر جمشید بھی چونکے — فاروق نے سوالیہ انداز میں ان کی طرف دیکھا جیسے پُوچھ رہا ہو — کھولوں یا نہیں ؟

"ٹھہرو فاروق — تم یہاں آ جاؤ — میں دروازہ کھولوں گا۔" انھوں نے کہا اور اُٹھ گئے۔

فاروق ان کی جگہ آ گیا — موجو بھائی کی آنکھوں سے اُلجھن جھانکنے لگی — اسی وقت انسپکٹر جمشید نے قدرے بلند

آواز میں کہا :

"ٹھہرو بھئی — کھولتا ہوں۔"

اب انھوں نے چٹخنی گرائی اور اس طرح کھڑے ہو گئے کہ پورا دروازہ چھپ گیا — دُوسرے یہ کہ دروازہ انھوں نے پورا نہیں کھولا — فوراً ہی انہیں محمود، فرزانہ، خان رحمان اور پروفیسر داؤد نظر آئے — انھوں نے جلدی سے آنکھ کا اشارہ کر دیا، وہ اندر کی طرف آنے کی بجائے یک دم پیچھے ہٹ گئے — انسپکٹر جمشید بھی باہر نکل آئے اور دروازہ بند کر دیا —

"آپ پہلے ہی یہاں موجود ہیں۔"

"ہم تو ذرا موجو بھائی کی خیریت معلوم کرنے آ گئے تھے — کہ وہ دس لاکھ روپے لے کر گھر پہنچ گیا یا نہیں۔"

"تو پھر؟" محمود نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"پھر کیا — اس کا بیان ہے — ایک ٹیکسی ڈرائیور اس سے دس لاکھ روپے ٹھگ کر لے گیا۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"لیکن — آپ لوگ یہاں کیسے آ گئے۔"

"کنور لیاقت کو قتل کر دیا گیا ہے۔" محمود نے کہا اور اسے بڑی حیرت ہوئی، کیوں کہ اس کے والد ذرا بھی نہیں چونکے

تھے —

"تو آپ کو پہلے ہی اطلاع مل چکی ہے۔"

"ہاں! موجو بھائی ہمیں یہ بات بتا چکے ہیں۔"

"تو انھوں نے قتل کا اقرار کر لیا ہے؟"

"نہیں — ان کی کہانی تو کچھ اور ہی ہے — ویسے تمھارے پاس ان کے خلاف کیا ثبوت ہے — صرف خنجر پر اُنگلیوں کے نشانات۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی نہیں — ایک اور بھی اہم ثبوت۔" فرزانہ مسکرائی۔ ساتھ ہی اس نے وہ چیز ان کے سامنے کر دی۔

"یہ تمھیں کہاں سے ملا؟" انھوں نے پوچھا۔

"لاش کے نیچے دبا ہوا تھا۔"

"اوہ — اوہ — اچھا تم اندر چلو — میں ابھی آیا۔" یہ کہ کر وہ تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" محمود نے ہانک لگائی۔

انسپکٹر جمشید نے کوئی جواب نہ دیا۔ گاڑی میں بیٹھے اور یہ جا وہ جا — وہ اندر داخل ہوئے — موجو بھائی نے ان کی طرف دیکھا:

"انسپکٹر صاحب کہاں رہ گئے؟"

"ابھی آتے ہیں۔" محمود نے کہا۔

"کیا یہ سچ ہے محمود — کہ کنور لیاقت کو قتل کر دیا گیا ہے۔"

"ہاں! اس میں کوئی شک نہیں — انھیں خنجر کے وار سے ہلاک کیا گیا ہے۔"

"اور اس پر میری اُنگلیوں کے نشانات ہیں — یہی بات ہے نا۔" موجو بھائی نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔"

"لیکن — انھیں — میں نے قتل نہیں کیا — میں پوری تفصیل انسپکٹر صاحب کو بتا چکا ہوں۔"

"بہت خوب — یہ آپ نے اچھا کیا۔"

اور پھر کافی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی — باہر بہت سے لوگوں کی موجودگی کے آثار نظر آئے تھے۔ محمود نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا —

نقلی والا

انسپکٹر جمشید اور کئی اور آدمی اندر داخل ہوئے۔
موجو بھائی نے پریشان نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا:
"خیریت تو ہے۔آپ ان سب لوگوں کو یہاں کیوں لے آئے؟"
"تاکہ اس قصّے کو ختم کر دیا جائے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔
"کیا مطلب؟"
"مجرم کتنا بھی چالاک ہو۔ پکڑا ضرور جاتا ہے۔"
"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"
"منصوبہ بہت سوچ بچار کے بعد بنایا گیا تھا۔ لیکن اس میں کچھ خامیاں رہ گئیں۔ اگر ذرا صبر سے کام لیا جاتا تو خرابیاں دُور کی جا سکتی تھیں۔ مگر نہیں۔۔ میں غلط کہ گیا۔ خرابیاں اس صورت میں بھی دور نہیں کی جا سکتی تھیں، کیوں کہ جرم چھپ نہیں سکتا۔ آج سے

سولہ سترہ سال پہلے۔ کنور لیاقت موجو بھائی سے کوئی زیادتی کر بیٹھا۔ موجو بھائی نے اس سے انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے اور تو کچھ نہ سوجھا۔ اس کی بچّی کو اغوا کر لیا۔ کنور لیاقت نے پولیس میں رپورٹ درج کرا دی۔ بچّی کی تلاش کا کام انسپکٹر سوکھے رام کے ذمّے لگایا گیا۔ اس نے ہر چند تلاش کیا، لیکن بچّی کنور صاحب کو نہ مل سکی۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ اور اس طرح سولہ سال گزر گئے۔ سولہ سال گزرنے کے بعد موجو بھائی نے کنور لیاقت کو خط لکھا۔ خفیہ خط۔ اس خط میں بتایا کہ بچّی اس کے پاس ہے اور اب وہ اسے واپس کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ اس کے ضمیر نے اسے چین نہیں لینے دیا۔ کنور لیاقت کو بھلا اور کیا چاہیے تھا۔ وہ ہر قیمت پر بچّی واپس لینے پر تیار ہو گئے۔ موجو بھائی نے اپنی جو شرائط بتائیں۔ سب انھوں نے مان لیں اور اس طرح اس دعوت کا انتظام کیا گیا۔ ادھر مجھے اور خان رحمان کو دو گمنام خط ملے کہ کنور لیاقت کی کوٹھی میں ایک جرم ہونے والا ہے۔ اور یہ کہ ہم اس جرم کے مجرم کو پکڑ نہیں سکیں گے؛ چناں چہ ہمیں بھی وہاں جانا پڑا۔ کنور لیاقت نے ہمارے ساتھ اچھا

سلوک نہیں کیا۔ ان کا خیال تھا کہ ہم جس تقریب میں
بھی جاتے ہیں۔ وہیں رنگ میں بھنگ پڑ جاتا ہے۔
تاہم ہم بھی باز آنے والے نہیں تھے۔ اندر داخل ہو
ہی گئے، پھر موجو بھائی وہاں آیا۔ بچّی اس کے ساتھ
تھی۔ اس نے دس لاکھ روپے کے بدلے بچّی کو کنور صاحب
کے حوالے کر دیا۔ اسے دس لاکھ دُوسری صبح ملنے
تھے، اس لیے وہیں ٹھہرا لیا گیا۔ میں نے رات سے
فائدہ اٹھانے کا پروگرام بنایا اور تفتیش شروع کی، کیونکہ
بظاہر تو ابھی تک وہاں کوئی جُرم نہیں ہوا تھا۔ ہم نے
گم شدگی کا سولہ سالہ پُرانا ریکارڈ چیک کیا، لیکن ابھی ہم
چیک کر رہے تھے کہ ہم پر حملہ کیا گیا۔ حملہ کرنے والوں
میں ایک شخص راشا بھی تھا۔ یہ ان کا انچارج تھا۔ ہم
راشا کا سُراغ لگا کر ایک جوئے خانے تک پہنچے۔ اور
وہاں سے جوئے خانے کے مالک جیدی کو گرفتار کیا۔
ریکارڈ روم پر حملہ جیدی کے حکم پر ہی کیا گیا تھا۔ اور جیدی
کی خدمات ہمارے نا معلوم مجرم نے حاصل کی تھیں۔ جیدی
کو بھی اس شخص کا نام معلوم نہیں تھا۔ اس لیے ہم مجرم
کا نام نہ جان سکے؛ تاہم اس بہانے اس جوئے خانے
اور جیدی سے لوگوں کا پیچھا ضرور چھوٹ گیا۔

دُوسری صبح مسٹر موجو بھائی کو کنور صاحب نے چیک
دے دیا۔ اور اپنا ایک مُلازم بھی بنک تک اس کے ساتھ
کر دیا۔ وہ بنک گئے۔ رقم نکلوائی۔ کنور صاحب کا آدمی
موجو بھائی سے رخصت ہو گیا۔ موجو بھائی نے ایک ٹیکسی
لی اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ لیکن ٹیکسی ڈرائیور
نے انھیں دھوکا دیا اور رقم کا بیگ لے اڑا۔ یہاں سے
موجو کا بیان سُنیے۔ ان کا کہنا ہے کہ رقم لٹا کر یہ کنور لیاقت
کی کوٹھی گئے۔ تاکہ اپنی داستانِ غم سنا سکیں۔ پھاٹک تو
کھلا تھا، لیکن اندرونی دروازہ بند تھا؛ البتّہ انھیں باغ
والی کھڑکی کھلی نظر آئی۔ یہ اس طرف سے چلے گئے، لیکن
کمرے میں کنور لیاقت مُردہ پڑے تھے اور ان کی کمر میں
خنجر موجود تھا۔ یہ گھبرا گئے۔ گھبراہٹ کے عالم میں اندر
پھلانگ گئے اور خنجر کو ہاتھ میں پکڑ لیا۔ لیکن اسی وقت
قدموں کی آواز سنائی دی۔ اور یہ خوف زدہ ہو کر وہاں
سے بھاگ نکلے۔ اور گھر آ کر دم لیا۔ اتنے میں ہم یہاں
پہنچ گئے۔ ہمیں انھوں نے یہ کہانی سنائی۔ ادھر سونیا نے
میرے گھر فون کیا اور میرے ساتھی وہاں پہنچے تو کنور
لیاقت کو مُردہ پایا۔ خنجر پر اُنگلیوں کے نشانات تھے،
سر کے بالوں میں ایک نیلے رنگ کا دھاگا تھا۔ اور لاش کے

نیچے سے انھیں ایک اور چیز مل گئی۔ اس چیز کے ملنے کے
بعد انھیں قاتل کے بارے میں کوئی شک نہ رہا۔ یہ سیدھے
یہاں آئے اور مجھے وہ چیز دکھائی۔ اس کے بعد میں ان
سب لوگوں کو بلا کر یہاں لے آیا۔ اب تو ساری کہانی آپ
لوگوں کی سمجھ میں آ گئی ہو گی۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو جمشید کہ کنور لیاقت کو موجو
بھائی نے ہی قتل کیا ہے۔" خان رحمان بولے۔

"ہاں! اور میں کہہ بھی کیا سکتا ہوں۔" وہ مسکرائے۔

"نن ۔ نہیں۔ یہ غلط ہے۔ جھوٹ ہے۔ میں نے انھیں
قتل نہیں کیا۔ بھلا مجھے کیا فائدہ انھیں قتل کرنے کا؟"
موجو بھائی نے چیخ کر کہا۔

"فائدے کی بات میں بتا دیتا ہوں۔ آپ نے اپنی
بیٹی سونیا کو ساری سکیم بتا دی تھی۔ کہ اب وقت آ
گیا ہے، کنور لیاقت کی بیٹی بننے کا اور ان کی ساری دولت
حاصل کرنے کا۔ اور ان کو قتل کر کے الگ کر دینے کا۔"

"نہیں نہیں۔ یہ غلط ہے۔"

"یہ غلط نہیں۔ بالکل صحیح ہے موجو بھائی۔ تم انکار نہیں
کر سکتے۔ سولہ سترہ سال پہلے تم نے ضرور انتقام کی نیت
سے کنور لیاقت کی بیٹی کو اغوا کیا تھا، لیکن بعد میں تم

نے سوچا۔ تم تو اس طرح بہت بڑا فائدہ اٹھا سکتے
ہو۔ کنور لیاقت کی بیٹی کی جگہ اپنی بیٹی کنور کو پیش
کر کے کہ سکتے ہو کہ یہ رہی تمھاری بیٹی۔ اور جب تم
اس کے بچپن کے کپڑے وغیرہ پیش کرو گے تو کنور لیاقت
کی کیا مجال کہ وہ اسے اپنی بیٹی تسلیم نہ کرے۔ اور
جب ایک بار وہ بھری محفل میں اسے اپنی بیٹی تسلیم کر
لے گا تو ساری جائداد اور دولت کی وہ مالک بن جائے
گی۔ اس کے بعد کنور لیاقت کو زندہ رکھنے کی ضرورت
ہی کیا رہ جائے گی۔ لہٰذا اسے ختم کر دیا گیا۔ اب کیا
کہتے ہو مسٹر موجو بھائی؟"

"بالکل غلط۔ آپ کے پاس کیا ثبوت ہے ان باتوں
کا۔"

"خنجر پر انگلیوں کے نشانات۔ تمھاری انگلیوں کے ہیں،
مقتول کے سر میں نیلے رنگ کا دھاگا۔ تمھارے کپڑوں
کا ہے۔ اب کیا کہتے ہو؟" وہ مسکرائے۔

"انگلیوں کے نشانات کے بارے میں میں آپ کو بتا
ہی چکا ہوں۔ بدحواسی کے عالم میں میں نے خنجر کو
پکڑ لیا تھا۔"

"اور وہ دھاگا۔"

"میرے لباس میں سے کوئی دھاگا نکلا ہوا دکھا دیں۔"

"ہوں ۔ تم خیال کر رہے ہو کہ ان تمام باتوں کو آسانی سے جھٹک دو گے، لیکن بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ تم لاش کے نیچے بھی اپنی ایک چیز چھوڑ آئے ہو۔ اگر تم نے صرف خنجر کو ہاتھ لگایا تھا۔ تو وہ چیز لاش کے نیچے کس طرح دب گئی ۔ میرا خیال ہے۔ تم اس بات کا کوئی جواب نہیں دے سکو گے ۔ کیوں ۔ ٹھیک ہے نا۔"

"کون سی چیز؟" اس نے گھبرا کر کہا۔

انسپکٹر جمشید نے وہ چیز اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا دی ۔ اس کی آنکھوں میں خوف دوڑ گیا۔ بدن تھرتھرانے لگا ۔ اور منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔

"مسٹر موجو بھائی ۔ کچھ بولیے ۔ خاموش کیوں ہو گئے۔" محمود نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

لیکن اس کے منہ پر تو تالا لگ چکا تھا۔

"یہ بے چارہ اب کیا بولے گا، لیکن کہنے کے لیے اب بھی چند باتیں رہ گئی ہیں۔ اور ان باتوں کے بغیر یہ کہانی مکمل نہیں ہو گی۔" انسپکٹر جمشید نے پُراسرار لہجے میں کہا۔

"چلیے ۔ وہ بھی بتا دیں۔" فرزانہ نے بے چین ہو کر کہا۔

"اس سے پہلے کہ آپ وہ باتیں بتائیں۔ پہلے یہ بات

صاف ہو جانی چاہیے کہ سونیا صاحبہ کنور لیاقت کی بیٹی ہیں یا موجو بھائی کی۔ اگر یہ موجو بھائی کی اپنی بیٹی ہیں تو پھر کنور صاحب کی بیٹی کہاں گئیں؟" اکرام نے الجھن کے عالم میں کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ یہ بات بہت اہم ہے، لیکن میرا خیال ہے۔ مجھے اپنے طریقے کے مطابق ہی بتانے دیں۔" انھوں نے کہا۔

"چلیے ۔ یوں ہی سہی" سب نے ایک ساتھ کہا۔

"تو پھر سُنیے ۔ سونیا صاحبہ موجو بھائی کی بیٹی ہیں۔ اور اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس نے کنور لیاقت کی بچّی کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔"

"اوہ ۔ اُف۔" کئی آوازیں اُبھریں۔

"کیوں مسٹر موجو ۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟"

"نہیں ۔ یہ بالکل غلط ہے۔" اس نے جھلّا کر کہا۔

"ان حالات میں بھی تم اپنے جُرم کا اقرار کرنے کے لیے تیار نہیں ہو ۔ خیر ۔ اب میں ایک ایسا ثبوت پیش کروں گا کہ تم کسی صورت جھٹلا نہیں سکو گے ۔ آ جائیں بھئی اندر۔"

یہ الفاظ انھوں نے دروازے کی طرف منہ کر کے کہے۔

"ہائیں اباجان ۔ یہ آپ کس کو بُلا رہے ہیں؟" فاروق

نے حیران ہو کر کہا۔

"مسٹر موجو بھائی کو۔"

"کیا فرمایا۔ موجو بھائی کو" محمود چلّا اُٹھا۔

"ہاں! موجو بھائی کو۔" وہ مسکرائے۔

"آپ۔ آپ بھول تو نہیں رہے۔ م۔ موجو بھائی تو یہ رہے۔ ہمارے سامنے۔"

"بھئی۔ یہ نقلی والے موجو بھائی ہیں۔ مَیں اصلی موجو بھائی سے سب کو ملوانا چاہتا ہوں۔" انھوں نے کہا۔

مارے حیرت کے ان کا بُرا حال ہو گیا۔ ایسے میں فاروق نے کہا:

"یا اللہ رحم۔ ایک موجو بھائی کیا کم تھا کہ اب دوسرے تشریف لا رہے ہیں۔"

اسی وقت ایک صاحب اندر داخل ہوئے۔ انھوں نے حیرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اسے پہلے دیکھ چکے تھے۔ لہٰذا فاروق نے فوراً کہا:

"ارے۔ یہ تو مسٹر مختار کریمی ہیں۔ انسپکٹر سوکھے رام کے پڑوسی۔"

"ہاں! یہ وہی ہیں، لیکن ان کا نام موجو بھائی ہے۔"

"اگر ان کا نام موجو بھائی ہے تو پھر ان صاحب کا

نام کیا ہے، جنھیں ہم اب تک موجو بھائی خیال کرتے رہے ہیں۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"ان کا نام انسپکٹر سوکھے رام ہے۔"

"کیا!!!" وہ زور سے چلّائے۔

ان کے منہ کھلے کے کھلے اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، اوپر کے سانس اوپر اور نیچے کے نیچے رہ گئے۔

چند لمحے تک موت کا سناٹا طاری رہا، پھر خان رحمان بولے:

"آخر یہ سب کیا ہے جمشید؟"

"انسپکٹر سوکھے رام اس کیس کی تفتیش کرتے کرتے موجو بھائی تک پہنچ گئے تھے، لیکن اس سے پہلے کہ یہ مجرم کو گرفتار کرتے اور بچّی کو کنور لیاقت کے حوالے کرتے۔ ان کے ذہن میں اچانک ایک شیطانی منصوبہ آیا۔ انھوں نے موجو بھائی سے کہا۔ اب تم عمر قید سے تو کسی طرح نہیں بچ سکو گے۔ صرف ایک صورت ہے بچنے کی۔ موجو بھائی نے پوچھا۔ وہ کیا صورت ہے۔ انھوں نے بتایا کہ بچّی

بچی کو ان کے حوالے کر دو اور اس معاملے کو ہمیشہ کے لیے بھول جاؤ۔ موجو بھائی بہت حیران ہوا۔ لیکن اسے [illegible] گیا تھا۔ عمر قید سے بچ رہا تھا؛ چنانچہ اس نے بچی کو ان کے حوالے کر دیا؛ تاہم اُلجھن میں رہا کہ آخر انسپکٹر بچی کا کیا کرے گا۔ لہٰذا وہ بظاہر اس سے دُور ہو گیا، لیکن رہا وہ یہیں ہی حُلیہ بدل کر اس کے پڑوس میں آ گیا۔ سوکھے کے ہاں ایک بچّی پیدا ہوئی تھی۔ لیکن وہ بچی مر گئی تھی۔ اس کی جگہ اس بچی نے لے لی۔ انھی دنوں اس نے گھر بدل دیا۔ موجو بھائی تو اُلجھن میں تھا۔ اس نے تعاقب کیا اور اس کے نئے گھر کا پتا لگا لیا۔ ابھی تک اس کی سمجھ میں نہ آسکا تھا کہ انسپکٹر کرنا کیا چاہتا ہے۔ لیکن اب جب کہ اس نے بچّی کو کنور لیاقت کے حوالے کیا۔ یہ سارا منصوبہ سمجھ گیا، لیکن کر ہی کیا سکتا تھا۔ خود بھی تو مجرم تھا۔ جب ہم انسپکٹر سوکھے کے گھر گئے۔ وہاں تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے ساتھ والے گھر کے دروازے پر دستک دی تو یہ صاحب باہر نکلے۔ اپنا نام مختار کریمی بتایا، لیکن ان کے بدن میں ہلکی سی تھرتھری تھی۔ میں اس تھرتھری کے بارے میں غور کرتا رہا۔ کوئی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ آخر میں نے ایک سادہ لباس والے کو ان کی نگرانی پر لگا دیا۔ مجھے

معلوم ہوا۔ یہ صاحب موجو بھائی کی نگرانی کر رہے ہیں۔ آخر جب موجو بھائی پر جُرم ثابت ہو گیا۔ تو میں نے انھیں جا پکڑا اور ان سے کہا کہ اب وقت ہے۔ وہ حقیقت اگل دیں، اور مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔ میری دھمکی کام کر گئی۔ اور انھوں نے مجھے ساری بات بتا دی۔ یہ ہے کُل کہانی۔"

یہاں تک کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔

"لل۔ لیکن۔ لیکن۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ۔ کہ میں۔" سونیا نے کانپتی آواز میں کہا، لیکن جُملہ مکمل نہ کر سکی۔

"ہاں! آپ موجو بھائی یا سوکھے رام کی نہیں۔ واقعی کنور لیاقت کی بیٹی ہیں۔"

"اوہ۔ اُف۔" ان سب کے منہ سے نکلا۔

سونیا رونے لگی۔ وہ تو اب تک خود کو سوکھے کی بیٹی خیال کرتی رہی تھی۔ اور اس منصوبے میں اس کی ہدایات پر عمل کرتی رہی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا۔ وہ خود اپنے باپ کے خلاف سازش میں شریک ہو رہی ہے۔ آخر اس نے لرزتی آواز میں کہا:

"میرا اس میں کوئی قصور نہیں۔ میں نے اس کی گود میں ہوش سنبھالا۔ اس کی تربیت میں رہی۔ لہٰذا جو اس نے کہا، میں نے ایک بیٹی ہونے کے ناطے کیا۔"

"ہاں! آپ کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ اُمید ہے، عدالت آپ کو سزا نہیں دے گی۔ معاف کر دے گی۔ میں بھی سفارش کروں گا، لیکن آپ کو سرکاری گواہ بننا ہوگا۔"

"ضرور۔ کیوں نہیں۔" اس نے فوراً کہا۔

"ایک بات رہ گئی۔ آخر سوکھے رام کو آپ اور انکل خان رحمان کو وہ خط لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ تو وہی بات ہو گئی۔ آ بیل مجھے مار۔ اگر یہ حضرت وہ خط نہ لکھتے تو شاید اپنے منصوبے میں کامیاب ہو جاتے۔" محمود نے جلدی جلدی کہا۔

"یہی تو تم سمجھے نہیں۔ وہ خط انسپکٹر نے نہیں۔ موجو بھائی نے لکھے تھے، تاکہ ہم اس معاملے میں دل چسپی لیں۔ اور اصل مجرم پکڑا جائے۔ اور ان کی یہ ترکیب بہت کارگر ثابت ہوئی۔" انسپکٹر جمشید نے مسکراتے ہوئے کہا، پھر انھوں نے موجو بھائی کی طرف دیکھا:

"کیوں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔"

"ج۔ جی ہاں۔" اس نے شرما کر کہا۔

"اس کا مطلب تو پھر یہ ہوا کہ یہ کیس ختم ہو گیا۔" فاروق بولا۔

"تو اور تم کیا چاہتے ہو۔ یہ جاری رہے اور کبھی ختم نہ

ہو۔" فرزانہ نے بُرا سا منہ بنایا۔

"نہیں۔ میں کیوں یہ چاہنے لگا۔ یہ چاہیں میرے دشمن۔" اس نے کہا۔

"ویسے مجھے ایک فیصد بھی گمان نہیں تھا کہ کیس کا یہ اونٹ اس کروٹ بیٹھے گا۔" محمود نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔

"گک۔ کیس کا اونٹ۔ یہ۔ یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔"

"دھت تیرے کی۔" محمود نے جھلا کر اپنی ران پر ہاتھ مارا۔ اور اُن کے چہروں پر مسکراہٹیں پھیل گئیں۔

ختم شد